جلد ۶ نمبر ۲ | بابت اپریل سنہ ۱۹۳۸ء | اقبال نمبر

طلباء مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کا علمی و ادبی سہ ماہی رسالہ

نگران

جناب ضیاء احمد صاحب بدایونی ایم۔ اے (لیکچرار شعبہ فارسیہ)

ایڈیٹر

محمد ابواللیث صدیقی البدایونی۔ بی۔ اے۔ آنرز (علیگ)

آہ! اقبال

آج اس نام کے ساتھ مرحوم لکھتے ہوئے ہاتھ کانپ رہا ہے اور قلم تھراتا ہے، آہ کسے معلوم تھا کہ مشرق کی امیدوں کا یہ آفتاب موت کی بدلی میں اس قدر جلد چھپ جائے گا۔ ہندوستان میں مولوی پیدا ہوں گے عالم پیدا ہوں گے، شاعر اور ناظم پیدا ہوں گے فلسفی اور مفکر پیدا ہونگے لیکن دوسرا اقبال پیدا نہ ہوگا۔ اس پر ہندوستان کو ناز تھا بلکہ دنیائے اسلام کے لئے اس کا وجود باعث فخر تھا۔

میگزین کی طباعت کے آخری مراحل طے ہوکر شیرازہ بندی شروع ہو چکی تھی کہ ۲۱ اپریل کی شب میں اس سانحہ عظیم کی خبر پہنچی، افسوس کہ علی گڑھ کا یہ ہدیہ عقیدت علامہ موصوف کی بارگاہ میں ان کی حیات میں پیش نہ ہو سکا۔

جس نے مغربیت کے بڑھتے سیلاب کے مقابلے میں اپنے جادو نگار قلم سے سد سکندری قائم کردی تھی، جس کی ذات الحاد اور بیدینی کی عالم گیر وبا میں ہماری محافظ تھی، جس کا وجود ہم تن آسانوں میں جدوجہد اور عمل و استقلال کا انقلاب پیدا کر رہا تھا آج رخصت ہوگیا۔ ہماری امیدوں کا یہ سب سے روشن چراغ تھا جسے موت کے ظالم ہاتھوں نے گل کر دیا۔

کچھ ہی عرصہ پہلے ڈاکٹر سر راس مسعود مرحوم کی وفات پر علامہ موصوف نے جو دردناک اشعار لکھے تھے اس میں فرمایا تھا۔

غمیں مشو کہ بہ بندِ جہاں گرفتاریم ‌ ‌ ‌ طلسمہا شکند آں دمے کہ ما داریم

لیکن افسوس کہ ان طلسمات کا شکست کرنے والا اب نظر نہیں آتا۔ وہ ایک مرد خود

آگاہ تھا جو خود کہہ چکا تھا۔

خوداآگہاں کہ ازیں خاکداں بروں جستند   طلسم مہرو سپہروستارہ بشکستند

خدا تیری تربت کو عنبریں کرے" "مہرانور اس پر نور کی بارش کرتا رہے" اور تیرے کلام سے فیض کے امرت کا جو چشمہ جاری ہے اس سے ملت اسلامیہ کو پیغام حیات ملتا رہے۔

"پنچھی اڑ گیا لیکن ڈالی ہل رہی ہے" پیغامبر آیا تھا رخصت ہوا لیکن پیغام باقی ہے۔"

قم باذن اللہ

جہاں اگرچہ دگرگوں ہے قم باذن اللہ
وہی زمیں وہی گردوں ہے قم باذن اللہ
کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وہی خوں ہے قم باذن اللہ
غمیں نہ ہو کہ پراگندہ ہے شعور تیرا
فرنگیوں کا یہ افسوں ہے قم باذن اللہ

۲۲ اپریل ۳۸ء   لیث صدیقی

۷۸۶

قطعہ تاریخ انتقال ڈاکٹر سر محمد اقبال

(از جناب مولانا احسن صاحب مارہروی)

زندگی کے پیچھے پیچھے یوں لگی آتی ہے موت — جس طرح ماضی کے بعد آمد ہوا استقبال کی
حل ہو، اسرارِ حیات و مرگ مشکل ہے مگر — عام لفظوں میں یہ ہے تفصیل اس اجمال کی
اس سرائے دہر میں جو آئے گا وہ جائے گا — ہر گھڑی ہے یہ منادی وقت کے گھڑیال کی
پائے گی وہ زندگی دنیا میں کیا پایندگی — جو رہے پابند ہو کر چند ماہ و سال کی
ہاں مگر وہ مرنے والا زندۂ جاوید ہے — جس نے چھوڑیں یادگاریں بہترین اعمال کی
بہتریں افعال ہوں یا بہترین اقوال ہوں — ثبت ہے ان پر دوامی مُہر استقلال کی
جسم مٹ کر خاک ہو جاتا ہے لیکن روحِ پاک — مٹ نہیں سکتی کسی خاکسترِ پامال کی
شاعرِ اقبال مند و سربلند و ہوش مند — دھوم ہے سارے جہاں میں جس کے قیل و قال کی
جس نے پھکوایا خزف ریزوں کو اور اُن کی جگہ — لعل و گوہر سے دُکانِ شعر مالا مال کی
اُٹھ گیا دنیا سے وہ لیکن نہ اُٹھے گی کبھی — دھاک جو بیٹھی ہوئی ہے اس کے استدلال کی
ہے دلیلِ راہ اُس کی شاعری سب کے لئے — پیروی ہوتی رہے گی دہر میں اس چال کی
ہے دعا تربت پر اُس کی پھول برساتی رہے — مرحمت اللہ کی الفت رسول و آل کی

کہئے احسن سالِ رحلت اور کیا اس کے سوا
ہے زوالِ علم و حکمت مرگ سر اقبال کی

۱۳ ھ ۵۷

۰۳۸-۴-۲۳

شاعرِ مشرق

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال

کی خدمت میں

علی گڑھ کا ہدیہ عقیدت

(لیث)

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

علی گڑھ میگزین

جلد ۱۶ نمبر ۲	اپریل ۱۹۳۸ء	اقبال نمبر

شذرات

۹ جنوری ۱۹۳۸ء کو علی گڑھ نے یوم اقبال منایا، اس تقریب میں ایک جلسہ پروفیسر اے۔ بی۔ اے حلیم پرو وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں مقالوں، نظموں اور تقریروں کی صورت میں ہماری جامعہ والوں نے علامہ اقبال کی خدمت میں خراج عقیدت پیش کیا، وہی موتی اب ایک لڑی میں پرو کر اقبال نمبر کے ذریعہ پیش نظر ہیں۔

ہمارا زمانہ کئی اعتبار سے ہندوستان کی تاریخ میں یادگار رہیگا، ایک طرف تو دنیا میں بے اطمینانی اور بے چینی کی جو عام لہر دوڑ رہی ہے اس کا تھوڑا بہت اثر اس ملک کی قدامت پرستی کے باوجود

یہاں کے عام حالات پر پڑ رہا ہے اور جو کشمکش سرمایہ داری اور محنت، شخصی اقتدار اور اشتراکیت، روحانیت اور مادیت کی جنگ کی صورت میں رونما ہوئی ہے یہاں کے عوام بھی اس میں حصہ لینا چاہتے ہیں، یہ دوسری بات ہے کہ وہ مشرق میں رہ کر بھی مغرب کی عینک لگا کر واقعات اور حالات کا مطالعہ کرتے ہیں

دوسری جانب خود ہندوستان کے حالات نازک سے نازک تر ہوتے جا رہے ہیں۔ سیاسی، ملکی، تمدنی، معاشرتی، اقتصادی اور لسانی مسائل نے پیچیدہ ہو کر ایسا ہنگامہ پیدا کر دیا ہے کہ اب اس کی طرف سے آنکھ بند کر لینا ناممکن ہو گیا ہے، عوام کے لئے اس "خارزار" میں الجھ کر نکلنا اب دشوار معلوم ہوتا ہے، رہے خود ساختہ لیڈر اُن کا اقتدار اور ان کی ذاتی منفعت اسی میں ہے کہ واقعات اسی طرح اُلجھے رہیں۔

جزئیات سے قطع نظر کیجئے تو عام ہندوستانی کی روزمرہ زندگی میں آج دو چیزوں سے انقلاب کے آثار پیدا ہیں یا پیدا ہونا چاہتے ہیں، ایک طرف مذہب اور دوسری طرف سیاست۔ مسلمان اپنے مذہب کو سیاست سے اور سیاست کو مذہب سے جدا نہیں کر سکتے، برادرانِ وطن کا تقاضا ہے کہ مذہب تو رہی انفرادی چیز من حیث القوم ہمیں پہلے ہندوستانی اور پھر ہندو یا مسلمان ہونا چاہیئے۔

مذہبیت کے بھی یہاں بہت سے رنگ ہیں، کچھ لوگوں نے صرف ضد، ہٹ دھرمی، خود غرضی، بغض و حسد، عناد اور کینہ کے مجموعہ کا نام مذہب رکھ چھوڑا ہے، بعض بالکل بے پرواہ ہیں اور بعض ابھی تک پرانی روحانیت کے قایل ہیں، لیکن اُن کی روحانیت کا نازک جہاز بھی مادیت کی چٹان سے ٹکرا کر اب شکست ہو رہا ہے، سائنس اور فلسفہ کی موشگافیوں نے ان کی بنیادوں کو ایسا کمزور کر دیا ہے کہ اب اس عمارت کا استحکام بعض لوگوں کو دشوار نظر آتا ہے۔

بعض مغربی مفکرین کے فلسفہ بے دینی اور الحاد نے بھی مذہب کے تخیّل کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے چنانچہ تمام تر شکوک اور شبہات کی اصل ان کی تصانیف میں ملتی ہے، اس پر غور

فکر کرنے کی بجائے بیچارے ہندوستانیوں نے اپنی کم علمی کی پناہ لیکر اس کشمکش کی طرف سے آنکھوں کو بند کر لینا اور کانوں میں اُنگلیاں دے لینا ہی مناسب سمجھا ہے، افسوس کہ وہ نہ قانون قدرت سے واقف ہیں اور نہ زمانے کی رفتار پر ان کی نظر ہے جو اپنے تیز دھارے میں ان کو خس وخاشاک کی طرح بہائے لئے جا رہا ہے، جسے اپنے نزدیک وہ پکّی دینداری اور راسخ الاعتقادی سمجھ رہے ہیں اسے مذہبیت کا دم واپسین سمجھئے جو برسر راہ ہے۔

رہی سیاست تو یہ بھی ہندوستان میں معجون مرکب بن کر رہ گئی ہے، ہندوستان میں اس نے عجیب قسم کی شدت حاصل کر لی ہے، اخباروں اور رسالوں کا آذوقہ جو بغیر اس کے بند رہتا اس کی بدولت کھُل گیا، لیڈروں کے رزق کا سامان بھی رزاق نے اسی بہانہ سے لکھا تھا، مولویوں اور مُلّاؤں نے بھی مذہب اور شریعت کو چھوڑ چھاڑ کر اسی کو اوڑھنا بچھونا بنایا۔ مفکرین نے بھی غور وفکر کو ترک کر کے اسی میدان میں اپنے خیال کو قلا بازیاں کھلانا شروع کر دیں، کالج اور یونیورسٹیاں بھی سیاسی اکھاڑے بن گئیں اور قوم کے نونہال خم ٹھونک ٹھونک کر اس میدان میں اتر آئے۔ فلمستان اسی سے آباد ہوا اور سیاسی فلموں کا اس نے ڈربہ کھول دیا۔ فقیروں کی خانقاہ، مُلّا کی مسجد اور مولوی کا مکتب، ایڈیٹر کا دفتر اور وکیل کا بستر سب اسی کے دم سے آباد ہو گیا۔ لیکن اصل سیاست اور حقیقت کو واضح کرنا کسی نے ضروری نہ سمجھا۔

مغرب سے کچھ سوداگر آئے، سیاست اور تدبر کے جال ساتھ تھے، "خاراشگافوں" کو "شیشہ گری" کا فن سکھایا، کالج کھولے تو شاہین بچوں کو زاغ وزغن کی شریعت سکھائی شیروں کو روباہی کی خو بتائی، پرانے خم کے متوالوں کو بلوری کنٹروں کی دعوت دی اور جب دیکھا کہ عالم سرد رکا ہے تو تہذیب وتمدن پر ڈاکہ ڈالا۔ حکومت پر چھاپہ مارا، اخلاق پر تصنع کا رنگ چڑھایا، مردوں سے حمیت گئی عورتوں کی غیرت رخصت ہوئی، مردنے رقص وسرود کو فخر جانا، ماہ طلعتوں نے زلف گرہ گیر

کے دام سے اُردو شعراء کے عاشق کو نجات دلائی، پردے کی کشمکش سے آزادی ہوئی، چلمن جو راہ میں حائل تھی ہٹ گئی اور جن جلوؤں کے لئے نگاہیں ترسا کرتی تھیں اب منظرِ عام پر دعوتِ نظر دینے لگے۔

شعر و شاعری کی دنیا بھی زوال کی تاریکی میں گم کردہ راہ تھی، شاعری جو کبھی معجزہ سمجھی جاتی تھی۔ جسدِ بے روح رہ گئی، شعر شعر نہ تھے الفاظ اور محاورات کے کھلونے تھے جن سے نادان شاعر کھیلتے اور دل بہلاتے، یا تو وہی پرانے گلے شکوے، وہی پرانی حکایت وہی فرسودہ داستان یا پھر انسان کی مجبوری اور عاجزی، دنیا کی بے ثباتی حرکت و عمل سے بیزاری، جد و جہد سے فرار جمود اور سکون کی تعلیم۔

افلاطونی تعلیم، بدھ متی پرچار اور ویدانت فلسفہ نے "نہ ہونے" میں ہونا کی تعلیم دی تھی، خود کو فنا کرو خودی کو مٹاؤ، خودی کے ساتھ قوتِ عمل بھی رخصت ہوئی جد و جہد کی جگہ تن آسانی نے لی، ابھرنے والی قومیں ڈوبنے لگیں، دنیا پر زوال آیا۔

ان حالات میں ایک مصلح، ایک مجدد، ایک مفکر، ایک معلّم، ایک محرک، ایک شاعر، ایک قلندر کی ضرورت تھی، عرب اس سے خالی تھا، عجم اس سے خالی، ہندوستان کی محفل سونی تھی کہ پھر کوئی شوریدہ سر، آتش نوا، پیدا ہو، جس کی شاعری معجزہ ہو جس کے کلام میں بجلیاں جس کی زبان تیغ سے زیادہ آبدار ہو، جس کی نگاہ عقاب سے زیادہ دور بین، جو دورِ انقلاب کی پیداوار ہو خود بڑا انقلابی اور ایک نئے انقلاب کا قاصد، جو قومی مصلح بھی ہو اور اسلام کا مبلغ بھی، جو عالم بھی ہو اور علم کی حقیقت بھی جانتا ہو، جو سیاست داں بھی ہو اور سیاست کے بازار میں کھرا کھوٹا پرکھنے والا جوہری بھی، جو محدود عشق کے دائرے سے آزاد بھی ہو اور ایک لامحدود عشق میں گرفتار بھی، جس

نے مغرب بھی دیکھا ہو اور مشرق بھی، جو اصل کا سومناتی ہو کر بھی لات و منات کو شکست کرے، جس کا نغمہ ہندی ہو اور ہے حجازی جو اسلام کا مورخ بھی ہو اور درخشاں مستقبل کی تاریخ کا بنانے والا بھی۔

ہندوستان کو ایسے فوق البشر کی ضرورت تھی مسلمان اسی کے انتظار میں بےچینی کی گھڑیاں گزار رہے تھے، قافلہ گم کردہ راہ تھا۔ کان بانگ درا پر تھے، میدان جنگ سامنے تھا ضرب کلیمی درکار تھی۔ جنبش سامعہ تشنہ نوائے الہام تھا بال جبریل کی حاجت تھی۔

مشرق سے یہ آفتاب ابھرا۔ گراں خوابی کا دور گیا، ہندوستان کی سرزمین سے اقبال پیدا ہوا، مغرب کے ساحروں کا سحر باطل ہوا، مشرق کو اس طلسم سے نجات کا پیغام ملا۔ مُردوں میں جان پڑی، جمود و سکون میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے۔

اے بہار کے پیغامبر تیرا آنا مبارک، اے درخشاں مستقبل کے قاصد خوش آمدید۔

میرا مقصد نہ علامہ موصوف کی شاعری پر تنقید کرنا ہے اور نہ میں ان کی تعلیمات کا خلاصہ پیش کر رہا ہوں مجھ سے بہتر لوگوں نے اس فرض کو ادا کر دیا ہے اور ہر ممکن پہلو سے ان کی شاعری اور اس کے اجزا اور پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے میں صرف چند الفاظ اشارتاً کہنا چاہتا ہوں۔

اقبال کی تعلیم کا سب سے اہم جزو "اثبات خودی" ہے، موصوف کے اس فلسفی نکتہ نے منکرین کے سامنے عمل کی ایک نئی شاہراہ کھول دی ہے۔ افلاطون کی اس تعلیم کا گہرا اثر ہر مفکر کے دماغ پر کار فرما نظر آتا ہے۔

گفت ستر زندگی در مردن است | شمع را صد جلوہ از افسردن است

کار او تحلیل اجزائے حیات | قطع شاخ سرو رعنائے حیات

فکر افلاطوں زیاں را سود گفت ، حکمت او بود را نابود گفت ،
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود ، جانِ او وارفتۂ معدوم بود ،
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام ، لذتِ رفتار بر کبکش حرام ،
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش ، از تپیدن بے خبر پروانہ اش ،

اقبال اس تعلیم سے بیزار ہیں جس نے خودی کی نفی سے انسان کو اپنی کمزوری کا غلط یقین دلایا اور قوموں کو زوال کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھادیا، خودی کے رتبہ سے وہ "گوسفندے در لباسِ آدم" ناواقف تھا۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے ، خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات ، خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
اندھیرے اُجالے میں ہے تابناک ، من و تو میں پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے ، نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار ، کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

انسان کو اپنی قوتوں کا اظہار اور نمود کرنا چاہیے

وانمودن خویش را خوئے خودی است ، خفتہ در ہر ذرہ نیروئے خودی است

کیونکہ

بے ذوقِ نمود زندگی موت ، تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت ، پربت ضعفِ خودی سے رائی

خودی کی موت ہی زوال کا اصلی سبب ہے

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور ، خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب ، بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و عظام
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر ، قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور ، کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامۂ احرام

لیکن اس خودی کو قانونِ الٰہی کا پابند ہونا چاہیئے اور خودی کی ترقی اسی میں مضمر ہے، اگرچہ خودی

قانونِ الٰہی کی پابند نہ رہے تو خود غرضی اس کی موت ہے۔

دوسرا اہم نکتہ ذوقِ عمل ہے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول — لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز — ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں، — محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے — شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول

یہ تعلیم علّامہ موصوف کے فارسی اور اردو کلام میں ہر جگہ موجود ہے اور ان کی تعلیمات کا اہم جزو ہے۔

ساحل افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم — ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

موجِ زخود رفتۂ تیز خرامید و گفت — ہستم اگر میروم گر نروم نیستم

مسلمانوں میں سب سے بڑی قوت ہی عمل اور جدوجہد کی تھی جس نے اٹھارہ سالہ نوجوان طارق کے قدموں پر ہسپانیہ کے مغرور شہنشاہ کا سر جھکا دیا، اسی نے بیس سالہ محمّد فاتح قسطنطنیہ کے گھوڑے کو سینٹ صوفیا کی قربان گاہ تک پہنچا دیا، اسی نے تپتے ہوئے صحراؤں اور زخار سمندروں میں اُن کی ہمت کو پہاڑوں سے زیادہ اٹل کر دیا، مغرب ان کے زیرِ نگیں آیا۔ مشرق پر اُن کا پرچم لہرایا، بقول مولانا شبلی سکندر اور دارا جب سفر کرتے تھے تو لاکھوں اور کروڑوں سپاہی خدام اور لشکر کی ضرورت محسوس ہوتی تھی تب کہیں معلوم ہوتا تھا کہ بادشاہ جا رہا ہے اور مسلمانوں کا تنہا خلیفہ[1] جب نکلتا" تو ایک شور ہوتا کہ عالم کا مرکزِ ثقل جنبش میں آگیا ہے"

---

[1] حضرت عمر فاروقؓ

ان کے ذوق عمل کا مظاہرہ صرف میدان جنگ تک محدود نہ تھا، علم وادب شعر وفن بھی ان کے دامن میں نہیں بلکہ ان کے دماغوں میں پرورش پاتے تھے وہ صاحب سیف تھے اور صاحب قلم بھی وہ صاحب تخت تھے اور صاحبِ کتاب بھی یونانیوں نے علوم وفنون کے مشک دریا بہائے تھے لیکن اب ان میں گدلے پانی کے سوا اور کچھ باقی نہ تھا، مسلمانوں نے طلب علم کو اپنا نہ بھی فرض سمجھا، حکم ہوا کہ علم حاصل کرو خواہ چین میں ہو[1]، چنانچہ جب یورپ جسے آج اپنے علوم وفنون پر بڑا ناز ہے بربریت اور جہالت میں مبتلا تھا، جب تعلیم وتدریس کو لوگ باعثِ شرم سمجھتے تھے۔ وحشیانہ عادات اطوار اور خصائل کو مردانگی کا اظہار جانتے تھے اس وقت مسلمانوں نے اپنے عمل سے ہدایت کی وہ مشعل روشن کی جس سے یورپ نے استفادہ کیا، متعصب مورخ خواہ تسلیم نہ کریں لیکن حقیقت یہی ہے کہ علوم وفنون کی جس قدر ترقی اور سرپرستی مسلمانوں نے کی دنیا میں کوئی دوسری قوم اسکی مثال پیش نہیں کر سکے گی، قرطبہ یونیورسٹی اب باقی نہیں مگر ہسپانیہ کے کھنڈر مسلمانوں کے اس دور پر اب بھی گواہ ہیں۔ لیکن صدیوں کی حکمرانی نے انھیں بھی تنعم سے آشنا کرا دیا اور وہ زندگی کی کشمکش کو کنارِ ساحل سے دیکھنے لگے، 'مقام راہ' کو انھوں نے 'منزل' سمجھ لیا اور یہیں سے وہ بلندی کی بجائے پستی کی طرف گرنے لگے، ان میں اگر کوئی انقلاب پیدا ہو سکتا ہے اور اقبال کا ایمان ہے کہ یہ انقلاب ہو کر رہیگا۔ تو پھر عمل اور جدوجہد کی طرف واپسی سے ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ اقبال کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے تن آسان مردوں کو ذوق عمل سے آشنا کرایا۔

اقبال مسلمان کو ایک 'فردِ کامل' دیکھنا چاہتا ہے، اُس کی دو خصوصیات کی طرف اشارہ

---

[1] اشارہ حدیث شریف اطلبوا العلم ولو کان بالصین،

ہو چکا، مزید تفصیل خود شاعر کی زبان سے سنئے۔

تنے پیدا کن از مشت غبارے | تنے محکم تر از سنگیں حصارے
درون او دلِ درد آشنائے | چو جوئے درکنار کوہسارے

مومن کی شان یہ ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن | گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت | یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم | دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

مسلمان کو خودی اور ذوق عمل کی تعلیم کے بعد وہ اجتماعیت کیطرف لیجاتے ہیں، اسے اُن کا فلسفہ بے خودی سمجھئے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنی خودی کو مستحکم اور مضبوط کر کے خود کو جماعت میں گم کردے تاکہ اُس کا وجود قائم رہ سکے، کیونکہ انفرادی حیثیت سے دنیا میں وہ کچھ نہیں کرسکتا اور جماعتی حیثیت سے وہ ایسی طاقت کا مالک ہو سکتا ہے جس کا مقابلہ کوئی نہیں کرسکتا۔

فرد را ربط جماعت رحمت است | جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش، | رونق ہنگامہ احرار باش
حرز جاں کن گفتۂ خیر البشر | ہست شیطاں از جماعت دور تر
فرد می گیرد ز ملت احترام | ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود، | قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم | ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

چنانچہ ان کے اسی خیال پر بعض لوگ انھیں پین اسلامزم کا مبلغ بتاتے ہیں کچھ عرصہ سے اسلامی ممالک میں بھی قوم کا جغرافیائی تخیل اسلام کے عالمگیر تخیل کی جگہ لے رہا ہے، سبب اس کا یہی ہے کہ مسلمان اسلام کی اصل تعلیم سے دور ہوتے جا رہے ہیں بلکہ نوجوانوں کی موجودہ نسل اُس

سے قطعی بے بہرہ ہے، ممالک اسلامی میں یہ جغرافیائی تقسیم نہ خود مختلف علاقوں میں رہنے والوں کے لئے مفید ہے اور نہ اسلامی طاقت کے اجتماعی نظام کو اس سے کچھ تقویت ہے۔ بعض دوستوں کا قول ہے کہ عرب اور ٹرکی کے مسلمانوں کو ہند کے مسلمانوں سے کچھ دلچسپی نہیں اور نہ وہ ان کے لئے کوئی جدوجہد کرنے کے لئے تیار ہیں۔ یہ ہماری غلط فہمی ہے۔ ایران، عراق اور ٹرکی کا جو معاہدہ یورپ کو سال گذشتہ لرزہ براندام کر رہا تھا اس بکھرے ہوئے اور منتشر نظام کو پھر ایک شیرازے میں منسلک کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔ مسلمان کے متعلق پہلا عقیدہ یہی ہے۔

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم — چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است — کہ ما پروردۂ یک شاخساریم

ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام کے پیش نظر اور مستقبل کے انقلاب کو سامنے رکھ کر اقبال کی سیاسی تعلیم بھی کم اہم نہیں، اس سلسلہ میں سب سے اہم نکتہ یہ ہے کہ دین کو سیاست سے جدا کرنا ان کی شریعت میں جائز نہیں۔

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادین — کنیز اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترک کلیسا سے حاکمی سے آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

دوسرا سوال وطنیت سے متعلق ہے۔ گذشتہ ماہ میں اس مسئلہ نے جو صورت اختیار کرلی اس کا ہمیں افسوس ہے۔ اس کی مزید تفصیل آپ کو ان ہی صفحات میں کہیں ملے گی

مولوی حسین احمد دیوبندی نے اپنی ایک تقریر میں بتایا تھا کہ قوم کا تخیل جغرافیائی حدود پر قایم ہوتا ہے[1]، اس کا جواب علامہ موصوف نے اپنی تعلیم کے مطابق یہ دیا۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

اس پر جو بحث ہوئی اس کی یہاں گنجایش نہیں۔ لیکن علامہ اقبال وطنیت کے اس تخیل سے بیزار ضرور ہیں جو ایک علاقہ میں رہنے والے افراد کو دوسرے علاقہ کی جماعت کا حریف اور مدمقابل قرار دیدیتا ہے، یہی وطنیت تنگ نظری اور تعصب کا روپ بھر کر انسان کے خون کو پانی سے بھی ارزاں کر دیتی ہے، دنیا آج اس سے بیزار ہے لوگ (Cosmopolitanism) پر بحث و مباحثہ کر رہے ہیں لیکن اسلام کی تعلیم اب سے چودہ سو سال پہلے یہی بات بتا چکی ہے۔
وطنیت کے علاوہ علامہ موصوف جمہوریت، اور اشتراکیت سے بھی بیزار ہیں۔ جمہوریت کے متعلق لکھتے ہیں۔

متاع معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبع سلیمانے نمی آید

گریز از طرز جمہوری غلام پختہ کارے شو
کہ از مغز دو صد خر فکر انسانے نمی آید

فرانس اور امریکہ کی جمہوریت اس صداقت پر گواہ ہیں۔

اشتراکیت کی انتہا پسندی سے وہ بدظن ہیں، مزدور اور دہقان کے مصیبت پر ان کا دل بھی

---

[1] ملاحظہ ہو "اقبال" اور "قوم کا تخیل"

دیکھتا ہے مگر تقسیم دولت کی جو صورت اشتراکیت بتاتی ہے وہ اسے قبول نہیں کرتے ورنہ کہتے وہ بھی ہیں جو ہر مسلمان کو کہنا چاہئیے۔

اٹھو میری دنیا کے غریبوں کو جگادو — کاخ امرا کے درو دیوار ہلادو
گرماؤ غلاموں کا لہو سوز یقیں سے — کنجشک فرومایہ کو شاہیں سے لڑادو
جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی — اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلادو
میں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے — میرے لئے مٹی کا حرم اور بنادو

اقبال کی تعلیم کے دیگر اجزا خود داری - یقین محکم، استحکام ملت وغیرہ ہیں، خودداری کے متعلق انکا ارشاد ہے۔

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست — مور بے پر حاجتے پیش سلیمانے مبر

یا

کرمک ناداں طواف شمع سے آزاد ہو — اپنی فطرت کے تجلی زار میں آزاد ہو

یا

تا توانی کیمیا شو گل مشو — در جہاں منعم شو و سائل مشو

ان کے تمام فلسفہ اور تعلیم کا لب لباب 'رجائیت' ہے، خود فرمایا ہے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار — فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

اے مسلم دل خستہ مصائب سے نہ گھبرا — خورشید نکلتا ہے سدا پردہ شب سے

میرا مقصود علامہ موصوف کی شاعری اور فلسفہ کا جائزہ لینا نہ تھا - اس کے لئے یہ مختصر جگہ کافی نہ ہوتی، علاوہ بریں ان مضامین میں جو آگے آئینگے آپ کو علامہ موصوف کی تعلیم اور فلسفہ کے ہر پہلو پر

کچھ نہ کچھ بہترین انداز میں ملے گا جس کے لئے میں خود انہوں کا مشکور رہوں جنکی تائید نے اس نمبر کو کامیاب بنادیا۔

آخر میں میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ علامہ موصوف کو صحت کلی عطا فرمائے تاکہ آپ ملت اسلامیہ کی رہنمائی اور رہبری میں مستعدی سے اپنی خدمت انجام دے سکیں۔ ہمارا ارادہ تھا کہ علامہ موصوف کے چند کلمات خیر اس نمبر کے لئے حاصل کریں گے اور ہمیں اس کا یقین کامل تھا لیکن آپ کی علالت نے اس کا موقع نہ دیا۔

لیکن اس مرتبہ آپ کا ایک گرامی نامہ شائع ہو رہا ہے جو آپ کے فلسفہ جہاد کا خلاصہ اور معترضین کے شکوک کا باصواب جواب ہے۔ اس کی اہمیت آپ پڑھنے کے بعد خود محسوس کرینگے۔ ہم ظفر احمد صاحب کے ممنون ہیں کہ آپ نے یہ خط ہمیں اشاعت کے لئے عنایت فرمایا۔

رسمیات کا میں قایل نہیں ورنہ شکریہ بہت سے عزیزوں، دوستوں اور بزرگوں کا ادا کرنا ہے جن کی تائید کے بغیر اس کا انجام پانا دشوار تھا۔

لیث صدیقی

مارچ ۱۹۳۸ء

اقبال کی تعلیم

ازجناب ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب ایم - اے
ڈی فل (آکسن) صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

(ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے فرمایا کہ یہ کوئی مقالہ نہیں خراج عقیدت ہے جو میں اقبال کی جناب میں اس موقعہ پر پیش کرتا ہوں -)

ستر اسی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک آواز گونجی جس سے زمین اور آسمان بھر گئے۔ اس آواز کا منبع علی گڑھ تھا۔ سر سید نے اس زور و شور کے ساتھ مسلمانوں کو خواب غفلت سے جگایا کہ در و دیوار گونج اُٹھے اور عالم اسلام میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سر سید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور اُن کے استقبال پر نظر کرکے سر سید کے زبان اور قلم تنبیہ اور تنبیہ، تدبر اور تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے۔

پہلا شخص جس نے سر سید کا پیغام شعر کے سانچے میں ڈھالا وہ حالی تھا۔ حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے درد دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے۔ دوست دشمن سب نے گردن ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا۔

لیکن سر سید کا پیغام ابھی اجمالی تھا۔ انہوں نے قوم کو اس قابل بنایا کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہیے۔ اس مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی۔

وہ شخص جس نے اس اجمال کی تفصیل کی۔ جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا۔ وہ اقبال ہے۔ اقبال نے اس جوش و خروش اور اس ولولہ اور اُمنگ کے ساتھ زبانِ شعر و ادب میں اس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اُس کا حصہ ہوگیا۔ حالی ہمارے حال کا شاعر تھا اقبال ہمارے استقبال کا شاعر ہے۔

ہندوؤں، بدھوں اور عیسائیوں کی تعلیم یعنی نفیِ خودی مسلمانوں میں پھیل گئی تھی۔ تصوف و انزوا نے اُن کے ہاتھ پیر شل کر دیئے تھے۔ نفیِ خودی کی بدولت وہ انفرادی خودی میں سکڑ کر رہ گئے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ سرِ حیات نفیِ خودی میں نہیں بلکہ خودی میں مضمر ہے۔ یہ کائنات خودی کا مظہر ہے۔ خودی پیدا کرنا ہی

خودی ہے جو تجھے ایک اعلیٰ تر خودی یعنی بے خودی میں لے جائے گی اور تو انفرادیت سے نکل کر اجتماعیت میں آجائے گا۔

یہ تمام مقامات اقبالؔ نے خود طے کئے۔ وہ آغاز شعر میں نفی خودی اور وحدتِ وجود میں مبتلا تھا۔ پھر اُس پر خودی اور وحدتِ وجود کا بھید کھلتا ہے۔ اور آخر میں وہ بے خودی پر منتہی ہو جاتا ہے۔

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ جس جس مقام سے گذرتا ہے ایک عالم کے عالم کو اپنے ساتھ لیجاتا ہے۔ جب وہ نفی خودی کا راگ گا رہا تھا لوگ اُسے الاپ رہے تھے۔ جب اس نے خودی کا ڈنکا بجایا ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی۔ اب جب کہ اُس نے بے خودی یعنی للّٰہیت اور قوم پرستی کا آوازہ بلند کیا سب اُسی میں آواز ملا رہے ہیں۔ آج مسلمانوں کا تمدن اور اُن کی سیاسیات بدرجۂ غایت اقبال کے شرمندۂ احسان ہیں۔

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے لق و دق بیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے مگر اس فلسفۂ حیات اور اسلامیات کے مبصر نے اُن کے لئے ایک مطمح پیدا کر دیا۔ جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سرعت کے ساتھ مانتے جا رہے ہیں۔ وقت آ رہا ہے اس کا جھنڈا عنقریب بلند ہو جائے گا۔

اقبالؔ کہتا ہے کہ ع من نوائے شاعرِ فرداستم۔ لیکن یہ ایک صدائے بازگشت ہے۔ اے اقبالؔ! تیری صدا سے عالمِ اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جا رہے ہیں۔ تو شاعرِ فردا ہی نہیں۔ تو شاعرِ امروز بھی ہے۔ اور تیرا اثر اتنا بڑا ہے کہ شاید کسی اور شاعر کا کبھی ہوا ہو۔ تو قومی شاعر ہی نہیں تو شاعرِ عہد ہے۔ یہ عہد تیرا عہد ہے۔ **عہدِ اقبال** ہے۔ کون شاعر تجھ سے پہلے یا تیرے زمانہ میں۔ ہندوستان یا ایران و خراسان بلکہ امریکہ و فرنگستان میں ایسا ہوا ہے جس کا تتبع اس درجہ کیا گیا ہو جس کی آواز میں اس طرح آواز ملائی گئی ہو۔ آج جو شخص بھی شعر کہتا ہے وہ اقبال کے رنگ میں کہتا ہے اقبال کی زبان میں کہتا ہے۔ جو مضامین بھی وہ بیان کرتا ہے اقبال کے مضامین ہوتے ہیں۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ بحریں بھی اقبال ہی کی ہوتی ہیں اور شعر سُنانے کا طریقہ بھی اقبال ہی کا طریقہ ترنم ہوتا ہے۔ ہاں یہ باوجود اس کے کہ ترنم کی کم نوائی شوکتِ مضمون کی متحمل نہیں!

زمانہ پر فرنگ چھا گیا تھا۔ اُس کا سیل بے پایاں ایسا چڑھا تھا کہ عالم اسلام بھی اُس میں ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔ اے اقبالؔ! تو نے اپنی معنی خیز اور سوز انگیز آواز سے ایک سدِ سکندری کھڑی کی اور اسے بتا دیا کہ؎

فرنگ سے بہت آگے ہے منزلِ مومن
قدم اُٹھا یہ مقام انتہائے راہ نہیں

اسلام اور ادبِ اسلامی ہمیشہ تیرا مرہونِ منت رہے گا۔ اسلام کو حق ہے کہ تجھ پر فخر کرے اور ہندوستان کا فرض ہے کہ تجھ جیسے فرزند پہ نازاں ہو۔ ہم دعا کرتے ہیں کہ تیرا کلام ہمیشہ قوم کے دل کو گرماتا رہے۔ اور اُسے عروج و اقبال کے آسمان تک پہنچائے تاکہ تیری دلی تمنا پوری ہو۔ اور تو قوم کا اقبال بن کر دیر تک باقی اور صحت و سلامتی کے ساتھ اس کا رہنما رہے!

پیامِ اقبال

(ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب کے صغیر سن صاحبزادے نے یومِ اقبالؒ کے موقعہ پر نہایت پرجوش انداز سے یہ نظم تحت اللفظ پڑھ کر سنائی اور کہا کہ)

حضرات! میں آپ کو اقبال کا پیغام پہنچاتا ہوں آپ لیڈر رہیں اور لیڈر بننے والے ہیں :-

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

یہ عقل و دل ہیں شرر شعلۂ محبت کے
وہ خار و خس کے لئے ہے یہ نیستاں کے لئے

مقامِ پرورش آہ و نالہ ہے یہ چمن۔
نہ سیرِ گل کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحرِ بے کراں کے لئے

نشانِ راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو
ترس گئے ہیں کسی مردِ راہ داں کے لئے

نگہ بلند، سخن دل نواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لئے

اقبال

از جناب غلام سرور صاحب ایم۔ اے
(لیڈس) لکچرار شعبہ انگریزی۔

شاعری کے متعلق زمانہ قدیم سے اختلاف چلا آرہا ہے۔

آج سے دو ہزار سال قبل یونان میں ایک طرف تو شاعری کو دیوی کا رتبہ حاصل تھا اور شاعر عقیدت کے پھول اس کی نذر کرکے اس سے فیض روحانی کا طالب ہوتا دوسری طرف اس زمانہ کے منکر اس کو سوسائٹی کے لئے خطر کا موجب قرار دے کر ٹھکراتے۔ افلاطون نے اپنی 'جمہوریت' میں حقیر ترین پیشہ ور کو جگہ دی لیکن اس غریب کو اس کی حدود سے باہر رکھا۔ اس پر یہ الزام تھا کہ یہ اپنے سحر سے عوام کے جذبات کو برانگیختہ کرکے سوسائٹی کے امن وعافیت کو تہ وبالا کرتا ہے۔ اور نوجوانوں کے اخلاق کو بگاڑتا ہے۔ اس کے برعکس رومن شاعر کو پیغمبر سے تعبیر کرتے تھے۔ اور اس کا شمار چوٹی کے لوگوں میں تھا۔ ورجل کا کلام وحی اور حدیث کا حکم رکھتا تھا اور لوگ اس سے اسی طرح فال نکالتے جس طرح ہندوستان اور ایران میں دیوان حافظ سے نکالتے ہیں۔ لیکن قرون وسطےٰ میں شاعری پر مسیحی کلیسا کا عتاب نازل ہوا۔ اور اس کے متعلق پرانے تعصبات کا احیا ہوگیا۔ وہ مذہب اور فلسفہ کی لونڈی ہوکر رہ گئی اور اس کی بجائے خود کچھ حیثیت نہ رہی۔ کئی سو سال اس نے اس غلامی میں گذارے لیکن بالآخر اس کی دعا مستجاب ہوئی اور نشاۃ ثانیہ میں اس کے دن پھرے اور نصیب جاگے۔ اور اس کے متعلق جو تعصب تھا رفتہ رفتہ دور ہونے لگا۔ آج اس کو جو رتبہ حاصل ہے اس سے اس کو محروم کرنا آسان کام نہیں۔ اس کا مقصد کیا ہے "کیا یہ انتہائی مقصود ہے یا وسیلہ مقصود"۔ اس سوال کا جواب ایک طول طویل بحث کا محتاج ہے جس کی یہاں گنجائش نہیں۔ جو لوگ اسے انتہائی مقصود تصور کرتے ہیں ان کی تعداد کم ہے۔ اور وہ اس سے محض مسرت روحانی اور ذوق حسن کی تسکین کے طلب گار رہتے ہیں۔ اسے کسی خاص مقصد کا وسیلہ بنانا ان کے نزدیک ناجائز ہے۔ اور اس کی فضیلت کو دھبہ لگانا ہے۔ اس نظریئے کے خلاف ایک معتد بہ گروہ اس امر کا قائل ہے کہ سوسائٹی کا رکن ہونے کی حیثیت سے شاعر کا فرض ہے کہ اپنے دماغ و قلم سے حتی الامکان اس کی خدمت کرے۔ اس کی خوبیوں کی داد دے اور اس کی کمزوریوں کی

اصلاح کرے۔ اپنی عقل و فکر سے حقائق حیات اس پر آشکار کرکے اسے شاہراہ ترقی پر گامزن ہونے کی تعلیم دے۔ آرٹ کے متعلق جس میں شاعری شامل ہے علامہ اقبال کا یہی نظریہ ہے اور ان کی شاعری کا یہی مقصود۔ ان کے مطابق زندگی انسانی عمل کا منتہائی مقصود ہے اور اس کو شاندار اور باوقار بنانے کے لئے انسان ہر وقت کوشاں رہتا ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ تمام آرٹ کو اس مقصد اشرف کے تابع فرماں رکھا جائے۔ افضل و اعلیٰ آرٹ وہ ہے جو ہماری خفتہ طاقتوں کو بیدار کرکے ہمیں زندگی کی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کرنے کے قابل بناتا ہے۔ وہ علوم و فنون جو ہمیں تعلیم عمل دینے اور ہماری قوتوں کو بیدار کرنے کے بجائے ہم پر غفلت و بے ہوشی طاری کردیں ہمارے لئے موت کا حکم رکھتے ہیں۔ آرٹ کا فرض یہ ہے کہ ہمارے اندر بیداری کی روح پھونکے۔ نہ کہ ہم پر حالت سُکر طاری کرے۔ فنون لطیفہ کی تعریف انہوں نے خود یوں کی ہے۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!
مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے — یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا!
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا!
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا!
بے معجزہ دنیا میں ابھرتی نہیں قومیں — جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا!

اقبال کی شاعری کو معجزے کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیئے۔

علامہ اقبال ایسی جامع شخصیت کے مالک ہیں جس کا ہر پہلو ایک غائر تحقیق اور مفصل تشریح کا متقاضی ہے۔ وہ محض شاعر ہی نہیں بلکہ حیات نو کے پیغامبر۔ سیاسی مجاہد۔ اسلامی زندگی اور فلسفہ کے مفسر۔ مسلمانوں کی قومی زندگی کے مصلح۔ بلند خیال مفکر۔ عمیق بین فلاسفر۔ اور مذہب انسانیت کے بہترین مبلغ ہیں۔ آج ہندوستان کے باہر دنیا کے حکما ء میں ان کا جو شہرہ ہے اور جو عزت انہیں نصیب ہوئی ہے اس سے ہمارے ابنائے وطن بہت کم واقف ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اس لعل بے بہا کو پرکھنے والے

جوہری ہماری بے مایہ قوم میں پیدا نہیں ہو سکتے۔ لعل کی قدر جوہری پہچانتا ہے۔ بے بضاعت لنگوٹی پوش کیا جانے۔ ہندوستان میں وہ زیادہ تر بحیثیت شاعر مشہور ہیں۔ اور وہ بھی اپنے کلام سے زیادہ اپنی آواز کی وجہ سے کچھ عرصہ پہلے بعض تنگ خیال جن کے نزدیک شاعری محض شین قاف کی درستی ہے۔ انہیں شاعر ماننے سے احتراز کرتے تھے۔ لیکن ان کی عالم گیر شہرت نے ان کے تعصب کا قلع قمع کر دیا ہے۔ بہ حیثیت مفکر و حکیم کے ان کی شہرت بین الاقوامی درجہ رکھتی ہے۔ وہ اس لئے کہ ان میں مشرق و مغرب دونوں کی بہترین معلومات کا نچوڑ موجود ہے۔ انہوں نے مغرب کے آگے مشرق اور خاص کر اسلام کی زندگی کا وہ پہلو پیش کیا جس سے وہ لوگ یا تو ناواقف تھے یا اپنے تعصب کی وجہ سے اس کے تصور و شناس سے قاصر تھے۔ تربیت کے لحاظ سے وہ محض ہندوستانی نہیں بلکہ ہندوستانی۔ ایرانی۔ یونانی۔ اسلامی اور مغربی تہذیب کے روشن عطیات کے حامل ہیں۔"

اقبال کی شاعری کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لئے ضروری ہے کہ کم از کم گذشتہ نصف صدی کی اردو شاعری کا مطالعہ کیا جائے۔ اس سے قبل تو کیا اب تک اردو شاعری بہت حد تک عاشق و معشوق کی الجھنوں میں پھنسی ہوئی ہے اور ان کی مستیوں سے اس کا چھٹکارا نہیں ہوپاتا۔ معشوق کی کج ادائی۔ بے وفائی جور و ستم۔ ناز و عشوے اور عاشق کے ضبط و صبر۔ شب ہجراں۔ درد فراق وغیرہ کی داستانیں ابھی تک چلی جا رہی ہیں۔ شاعروں کے تخیل کی برکت سے معشوق قصاب ہو گیا اور عاشق بھیڑ۔ سالہا سال سے معشوق کے خنجر اور عاشق کے گلے میں نبرد آزمائی ہو رہی ہے۔ مگر یا تو خنجر میں دھار نہیں یا عاشق کا گلا سنگِ خارا کا بنا ہے کہ ابھی تک شہ رگ کٹنے میں نہیں آتی کہ قصہ پاک ہو جائے۔ اور شاعر کو اس فرسودہ قصے کو بکنے اور لوگوں کو اس کے پڑھنے سے نجات حاصل ہو۔ کئی شعراء کے کلام میں خون۔ جگر۔ دل۔ کلیجے۔ خنجر وغیرہ کی تکرار سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی مذبح سے فیض حاصل کیا ہے۔ اگر اس خونی منظر سے کنارا کر کے وہ نزاکت و لطافت کی طرف متوجہ ہوئے تو یار کی کمر پر وہ طبع آزمائی کی کہ اسے گھستے گھستے غائب کر دیا اور پھر اس کی تلاش میں لگے سر دھننے۔ سوز و گداز کے بیان پر اترائے تو معلوم ہوا کہ لوہار خانے سے دھونکنی کی آواز

آرہی ہے۔ یار کی آنکھوں کی تعریف شروع کی تو انہیں ایسا کھینچا کہ وہ حضرت نوحؑ کی کشتی کا ایک چھوٹا خاکہ معلوم ہونے لگیں۔ اس کا قد ناپنے کے لئے تاڑ کے گز بنائے۔ غرضیکہ اپنے تخیل سے انہوں نے ایک ایسا ہیولا تیار کیا جس میں کوئی انسانی وصف نہیں ملتا۔ گو بظاہر یہ تنقید کرخت معلوم ہو۔ لیکن اگر پہلے دواوین کا بہ لظر انصاف مطالعہ کیا جائے تو ماسوائے لفظی الٹ پھیر۔ تشبیہ و استعاروں اور بندشوں اور ترکیبوں کے کچھ نہیں ملتا۔ باربار ایک ہی خیال کو مختلف الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے اور اسے کمالِ فن سمجھا جاتا ہے۔ ہر دیوان میں جگہ بہ جگہ یا تو میاں عاشق چاک گریباں کئے۔ بال بکھرے۔ پریشان حال۔ مدقوق صورت لئے مصروف بہ گریہ وزاری ہیں یا معشوق تیر و تلوار۔ خنجر و پیکاں۔ تیغ و سناں۔ بلم۔ برچھی۔ کٹار سے مسلح ان کی گردن کو تن سے جدا کرنے پر مستعد۔ یہ سلسلہ کم و بیش غالب تک ملتا ہے (اس کے بعد گو اردو شاعری کا ایک نیا دور شروع ہوتا ہے مگر پرانی روایات کا کلی خاتمہ نہیں ہوتا۔ اور غالب کی شاعری بھی کلیتہً اس سے مبرا نہیں۔ شاعری پر شاعر کے سیاسی۔ مذہبی اور معاشرتی ماحول کا بہت اثر پڑتا ہے۔ مثلاً زمانہ جنگ کی نظموں میں سرد سے سرد خون کو گرمانے اور پست ہمتوں کو بلند کرنے کی خاصیت ہوتی ہے۔ کسی قومی مصیبت کے زمانہ کے کلام میں رنج و غم کے جذبات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی طرح قومی جمود۔ انحطاط۔ زوال۔ نکبت اور افلاس کے وقت کی شاعری میں افسردگی۔ پژمردگی۔ مایوسی۔ کم ہمتی۔ لاچاری اور مجبوری کے سوا کچھ نہیں ملتا۔ یہی حالت اردو شاعری کی مغلیہ سلطنت کے زوال کے وقت تھی جو غالب کے زمانہ تک چلی آئی۔ غالب نے ایک طرف تو مغلیہ خاندان کی تباہی اور ملک کی بربادی کا نقشہ دیکھا دوسری طرف غدر کی مصائب جھیلیں۔ اور فاتح قوم کے قہر و عتاب اور سفا کی و بربریّت کا نظارہ دیکھا۔ جور و جفا اور استبداد کا جو قابلی اثر شاعری پر ہوتا ہے۔ وہ اس کے کلام سے ظاہر ہے) یاس و ناامیدی افسردگی و پژمردگی۔ معذوری و لاچاری اس کا جزو ہے۔ چونکہ غدر کی ذمّہ دار مسلمان ٹھیرائے گئے تھے اس لئے وہ خاص طور پر مورد عتاب ہوئے۔ اس پر آشوب زمانہ میں اگر مردے از غیب، سرسید علیہ الرحمۃ کی صورت میں ظاہر نہ ہوتا اور انہیں ایک نہایت وفاکیش و مخلص گروہ کی مدد نصیب نہ ہوتی تو آج ہندوستان میں مسلمانوں کی

حالت پوربی گھسیاروں کی سی ہوتی۔ سرسید غیر معمولی فہم وادراک۔ عزم با لجزم اور درد قومی کے علاوہ اس دلیری و بیباکی کے حامل تھے جس کی ہر سیاسی پیشوا کو ایسے عظیم خطرے کے زمانہ میں ضرورت ہوتی ہے۔

ان کی بے نظیر ہمت اور عدیم المثال اور ان تھک کوششوں سے نہ مسلمان ہی صرف تباہی سے ان کی احیا کا دور شروع ہوا۔ ان کے گرد باعمل اصحاب کا جو گروہ جمع ہو گیا ان میں مولانا حالی مرحوم خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ کیونکہ انہوں نے سب سے اوّل شاعری میں قومیت کے ساز سے سوز و گداز کی لے نکالی (جہاں سرسید نے اپنی قوم کو باآواز بلند للکارا انہوں نے اس کو اپنے مخصوص انداز سے درد و غم بھرے الفاظ میں اس کی حالت سے آگاہ کر کے بیدار کیا۔ اسے اپنی حقیقت سے آگاہ کر کے راہ عمل پر گامزن کرنا علامہ اقبال کا کام ہے۔ ان کے کلام میں وہ افسردگی اور مایوسی مفقود ہے۔ جو اردو شاعری کا جزو لاینفک بن گئی تھی، اس کی بجائے امید ہر جگہ جلوہ کناں ہے۔ جس شاعر کا مقصد حیات اپنی قوم کو پستی کے گڑھے سے نکال کر بام رفعت پر پہونچانا ہو اسے افسردگی و مایوسی سے کیا کام؟ اگر وہ خود مایوس ہو جائے تو مایوسوں کی کیا ہمت بندھائے گا؟ مایوس ہونا تو کجا وہ مایوس کن حالات سے بھی امید کا سامان پیدا کر لیتا ہے جس طرح پتھر کو پتھر سے ٹکرا کر چنگاری حاصل کی جاتی ہے۔ رجائیت علامہ اقبال کے کلام کی روح و رواں ہے۔ اور امید اس کی صفتِ خاص۔)

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کارزار

(عالم اسلام کی موجودہ پست حالت ان کے حسن ظن کو کبھی مسخر نہیں کر سکتی۔ کیونکہ وہ انگریزی کی اس مثل کے معتقد ہیں کہ ہر تاریک بادل کی سنجاف نقرئی ہوتی ہے۔ اس لئے اپنے ابنائے ملت کی ڈھارس بندھانے کے لئے فرماتے ہیں۔

اے مسلم دل خستہ مصائب سے نہ گھبرا خورشید نکلتا ہے سدا پردۂ شب سے

ان کی اس امید کا راز اس فلسفے میں مضمر ہے کہ کسی قوم یا فرد کے زوال کی ایک حد معین ہوتی ہے اور اگر وہاں پونچکر وہ اپنی زبوں حالت کو محسوس کرے اور اسے سدھارنے کی غرض سے جدو جہد کے

ذریعے اپنی زندگی کا ثبوت دے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ پستی کے گڑھے میں پڑا رہے۔ اس کی حالت ضرور ایک دن پلٹا کھائے گی۔ کیونکہ دنیا کا نظام تغیر و تبدل کے اصول پر قائم ہے۔

ذیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی　　افق سے آفتاب ابھرا گیا دورِ گراں خوابی

جنگِ عظیم کے بعد ترکوں کی تباہی نے عالمِ اسلام کے دل پر غم و اندوہ کی برچھیاں چلائیں اور لوگوں کو گمان ہونے لگا کہ ان کے ساتھ عالمِ اسلام کی ناؤ بھی ڈوب جائے گی۔ مگر علاّمہ اقبال نے جو سطحی حالات سے قطع نظر کر کے حقیقت کا مشاہدہ کرتے ہیں امید کی باگ ہاتھ سے نہ دی۔ بلکہ اپ نے مخصوص فلسفیانہ انداز میں فرمایا۔

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے　　کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

یہ رجائیت ان کے کلام کا جزو لاینفک اور ان کے ایمان کا عظیم حصہ ہے۔ انہیں اسلام کی قطعی فتح و نصرت پر پورا یقین ہے اور اس کی استواری و استحکام پر کامل ایمان۔ کیونکہ وہ ایسے اصول و قوانین کا مرکب ہے جو بنی نوعِ انسان کی حقیقی فلاح و بہبود کے مؤ ہیں۔ ایک نوجوان کو نصیحت دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

نہ ہو نومید نومیدی زوالِ علم عرفاں ہے　　امیدِ مردِ مومن ہے خدا کے رازدانوں میں

ان کی شاعری میں غالب کے فلسفے۔ داغ کی شیریں بیانی اور حالی کی "قومیات" پر رجائیت اور امید کا اضافہ ہے۔

اقبال کا درجہ بہ حیثیت ایک حکیم اور مفکّر کے بہت بلند اور ممتاز ہے۔ انہوں نے اپنے مخصوص شاعرانہ انداز میں زندگی کے اہم سربستہ اسرار کو منکشف کر کے معلوماتِ انسانی میں بیش بہا اضافہ کیا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اسلام اور مشرقیات کے متعلق تاریخِ عالم میں ایک جدید باب کا اضافہ کیا ہے۔ جس سے مشرق کے متعلق مغرب کا زاویہ نگاہ بدلنا ضروری امر ہے۔ مغرب کے لئے مشرق سے جو اس کے نزدیک جہان خواب و خموشی ہے ایسے شاعر کی نمود جو تعلیمِ عمل دیتا ہے اور جس کا کلام منوّم ہونے کی بجائے متحرک ہو۔

ایک معجزے سے کم نہیں علامہ موصوف پر تمام مقتدر جرمن فلاسفہ مثلاً کانٹ۔ برگسان۔ شوپن ہار۔ نیٹشے کا اثر ہے مگر ان کے اور نیٹشا کے خیالات میں جہاں تک عمل اور جہادِ زندگی کا تعلق ہے بہت مطابقت ہے۔ اس اثر سے یہ مراد ہرگز نہیں کہ وہ ان حکماء سے تتبع کرتے ہیں۔ وہ خود ایک ایسی ذات کے مالک ہیں جو کسی متابعت کی روادار نہیں ہو سکتی۔ اور ان کی فکر بیرونی امداد سے بے نیاز ہے۔ کسی نظرئیے میں ان کا کسی مفکر سے ہم خیال ہونا اس امر کی دلیل نہیں کہ وہ اس کے خوشہ چیں ہیں۔ جرمن حکماء میں نیٹشا سب سے بڑا مبلغ عمل و کردار رہے۔ جس کے فلسفہ جہاد نے جرمن قوم میں ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ جنگ عظیم سے قبل جرمنی کی جنگی تیاریاں۔ اس کا پروگرام۔ اس کی عملی تجاویز۔ اس کی 'پالیٹی' (نظام حکومت) سب اسی کے فلسفۂ زندگی و عمل کے سحر سے مسحور تھے۔ اور اس کی تعلیم کا اثر تمام قوم کے رگ و ریشے میں سرایت کر گیا تھا۔ جس کی وجہ سے عمل اور جہاد اس کا ورد ہو گیا۔ اس عمل کا انتہائی مقصود اقتدار تھا جس کے ذریعہ سے جرمن قوم دیگر اقوام عالم پر فوجی۔ اقتصادی اور سیاسی لحاظ سے فوقیت حاصل کرنا چاہتی تھی۔ نیٹشا کا 'فوق البشر' اور اقبال کا 'فردِ کامل' ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ مگر ان کے اوصاف و خصائص کے متعلق ان کے خالقین میں اختلاف ہے۔ نیٹشا کا 'فوق البشر' ایسے اوصاف سے متصف ہے جو اسے دائرہ انسانی سے نکال کر دیو بناتے ہیں اور اسے انسانی خدمت کی بجائے انسانی قربانی پر مائل کرتے ہیں۔ نرمی۔ ہمدردی۔ رحمدلی اور دیگر ایسی صفات کا اس میں کلی فقدان ہے بلکہ وہ انہیں کمزوریاں خیال کرتا ہے۔ اس کے برعکس اقبال کا 'فردِ کامل' عمل کے ساتھ اخلاق کا مجسمہ ہے۔ اور اس کی زندگی کا مقصد بنی نوع انسان کی خدمت۔ وہ اپنی صفات کی بنا پر سوسائٹی سے الگ تھلگ رہنے کی بجائے اس سے اپنے آپ کو پیوست کرتا ہے۔ تاکہ دوسروں کو بھی اپنے بلند درجہ پر لانے میں کامیاب ہو۔ ایک کا کام کمزوروں کو مٹانا ہے دوسرے کا کمزوروں کو طاقتور بنانا۔ اسی مردِ کامل کی تخلیق اسطور ہو رہی ہے۔

تنے پیدا کن از مشتِ غبارے   تنے محکم از سنگین حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے   چو جوئے در کنارِ کوہسارے

ایک سچے اور حقیقی مسلمان ہی میں مرد کامل ہونے کی اہلیت ہے۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم　　دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

اقبال اور نیٹشا میں یہ اختلاف ایک قدرتی امر ہے۔ نیٹشا مذہب کا دشمن اور خدا سے منکر ہے۔ گو بعض اخلاقی نتائج میں اس کے افکار اسلام کے قریب ہیں۔ اس کے خلاف علامہ اقبال مذہب کو انسانی زندگی کی تکمیل کے لئے ناگزیر سمجھتے ہیں۔ اس کے بغیر افراد و اقوام دونوں صراطِ مستقیم سے اتر کر دنیا کی تباہی و بربادی کا موجب ہوتے ہیں۔ نیٹشا کا مذہب لامذہبی بنا اور اس کے فلسفے کی بنیاد تمام تر محسوس پر ہے۔ مذہب کے وہ اصول جو انسان کو نرمی۔ رحمدلی۔ مروت۔ سخاوت وغیرہ سکھاتے ہیں وہ اس کے نظریۂ زندگی کے خلاف ہیں۔ اس کا فوق البشر ان سے عاری ہے۔ اسی لئے وہ انسانی زمرے سے خارج ہو کر دیو کی ہیئت کذائی اختیار کرتا ہے جس کی طاقت اور خصلیت کا مظاہرہ جنگ عظیم میں ہوا۔ اس کی اور اس کے خالق (نیٹشا) کی بابت علامہ موصوف نے کہا ہے۔

از سستی عناصرِ انساں دلش تپید　　فکرِ حکیم پیکرِ محکم بر آفرید

افگند در فرنگ صد آشوب تازہ　　دیوانۂ بکار گہ شیشہ گر رسید

گر نوا خواہی ز پیشِ او گریز　　در نے کلکش غریو تندر است

نیشتر اندر دلِ مغرب فشرد　　دستش از خون چلیپا احمر است

آنکہ بر طرح حرم بتخانہ ساخت　　قلب او مومن دماغش کافر است

وہ محض جسمانی قوتوں کا پیکر ہے جن کی نشو و نما نیٹشا اس طریق پر کرنا چاہتا ہے کہ ان کا حامل ان کی وجہ سے دیگر بنی نوع انسان پر فوقیت اور غلبہ و اقتدار حاصل کرے۔ اس کی یہ جسمانی طاقتیں روحانی خواص کے تابع اور محکوم نہیں۔ کیونکہ نیٹشا روحانیت کا قائل نہیں۔ اس کے برعکس علامہ اقبال روحانیت کے پکے معتقد ہیں۔

ان کا فردِ کامل بے باکی۔ جرأت۔ تنومندی اور جفاکشی کے علاوہ جملہ اخلاقی وصائف کا مجسمہ ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد عمل اور نصب العین انسانی خدمت ہے۔ کشمکش کے علاوہ تصادم و پیکار بھی اس کی ذات کی تکمیل کے لئے ضروری ہیں۔ اقبال کے نزدیک کسی قوم کا حق وصداقت کی حمایت میں برسرِ پیکار رہنا جائز ہے۔ لیکن جس جنگ کا مقصد محض ملک گیری ہو اور جس کی محرک جوع الارض ہو اور جس کی تہ میں شہنشاہیت کے جذبات کام کر رہے ہوں وہ بے حد مکروہ اور کلیتہً ناجائز ہے۔

علامہ اقبال کا تاریخ اسلام کا مطالعہ بہت گہرا اور وسیع ہے۔ ان پر عیاں ہے کہ جب تک عمل مسلمانوں کی زندگی کا مقصد رہا وہ شاہراہ ترقی پر بڑھتے گئے اور دنیا کی کوئی طاقت ان کے سیلاب کو نہ روک سکی۔ اور ان کی زندگی بہمہ نوع کامیاب رہی۔ میدانِ جنگ میں فتح کا سہرا ان کے سر رہتا اور زمانہ امن میں ان کی تحقیق وتدقیق دنیا سے خراجِ تحسین وصول کرتی۔ وہ تلوار اور قلم دونوں سے کام لیا جاتے تھے اور دونوں کی مدد سے جو فتوحات انہوں نے حاصل کیں دنیا انہیں آج تک تسلیم کرتی ہے۔ لیکن جب سالہا سال کی حکمرانی کے اثر سے ان میں تنعم کی کمزوریاں پیدا ہوگئیں اور انہوں نے عمل کی بجائے تن آسانی اختیار کی تو ان پر تنزل۔ انحطاط اور ادبار کی گھٹائیں چھا گئیں۔ اور وہ بالآخر حاکمی کی بلندیوں سے محکومیت کے گڑھے میں گر گئے۔ اس محکومی سے ان کے تمام ارادے پست اور ان کی قوتیں شل ہوگئیں۔ اس سے جو جمود عالمِ اسلام پر طاری ہوا اس کی تلخ حقیقت اس علامہ پر روشن ہے۔ جس سکون کو مسلمان اب تک امن وعافیت سے تعبیر کرتے رہے ہیں وہ اسے ان کی قومی زندگی کے لئے زہرِ ہلاہل سمجھتے ہیں۔ زندگی ان کے نزدیک مسلسل جدوجہد اور لاانتاہی فضیلت ہے۔ جہاں پر ختم ہوئی موت آئی۔ ان کا کلام اسی پیہم جدوجہد کی تعلیم سے لبریز ہے۔

ساحلِ افتادہ گفت گرچہ بسے زیستم ۔۔۔ ہیچ نہ معلوم شد آہ کہ من کیستم

موجے زخود رفتہ تیز خرامید وگفت ۔۔۔ ہستم اگر میروم گر نہ روم نیستم

زندگی محض روانی تنفس کا نام نہیں۔ نہ روزمرّہ کے معمولی افعال مثلاً کھانے۔ پینے۔ سونے جاگنے کا

بلکہ مسلسل عمل اور پیہم جد وجہد کا۔

در عمل پوشیدہ مضمون حیات　　لذتِ تخلیق قانونِ حیات

اس عمل کی وجہ سے ہر روز اس میں کچھ نہ کچھ فرق ہونا چاہیئے۔

دما دم نقشہائے تازہ ریزد　　بیک صورت قرار زندگی نیست
اگر امروزِ تو تصویرِ دوش است　　بہ خاکِ تو شرارِ زندگی نیست

گو یہ جدّ وجہد جسمانی تکلیف و آزار کا باعث ہے مگر اس سے حیاتِ جاوداں حاصل ہوتی ہے۔

میارا بزم بر ساحل کہ آنجا　　نوائے زندگانی نرم خیز است
بدریا غلط و با موجش درآویز　　حیاتِ جاوداں اندر ستیز است
سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت　　شریکِ سوز و سازِ بحر و بر شو
تو ایں جنگ از کنارِ عرصہ بینی　　بمیر اندر نبرد و زندہ تر شو

سخت کوشی حقیقی زندگی کا جزو ہے۔
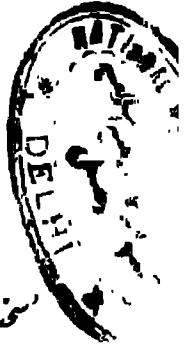
بہ کیشِ زندہ دلاں زندگی جفا طلبی است　　سفر بکعبہ نہ کردم کہ راہ بے خطر است

اور خطرہ اس کی خفتہ قوتوں کو بیدار کر کے ان کو اظہار کا موقع دیتا ہے۔

خطر تاب و تواں را امتحان است　　عیارِ ممکناتِ جسم و جان است

حرارت تپش اور گرمی زندگی کی علامات ہیں جو انسان کو کبھی ایک جا قرار لینے اور اس کی فضیلت کو ساکن ہونے کی اجازت نہیں دیتیں۔ ان کا فرض تحریک ہے۔ کرمِ کتابی، کو یہ نکتہ پروانہ نیم سوز نے بتایا

تپش مے کند زندہ تر زندگی را　　تپش مے دہد بال و پر زندگی را

یہ تپش، انسان کو عمل پر آمادہ و مستعد رکھتی ہے۔ مسولینی آج یورپ کی چند قوموں کی نظر میں اس لئے کھٹک رہا ہے کہ اس نے اپنے ملک کو سیاسی اعتبار و اقتدار میں ان سلطنتوں کے ہمدوش کر دیا ہے جنہوں نے دنیا پر حکمرانی کرنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اس کی فتح حبش اخلاقی نکتۂ نگاہ سے واقعی

ایک مجرمانہ فعل ہے۔ مگر یورپ کی سیاسیات کو اخلاقی اصولوں سے کچھ سروکار نہیں۔ میکیاویلی کے تابعین شہنشاہیت کے اغراض و مقاصد کی تکمیل میں ہر قسم کی عیاری۔ مکاری۔ جفاکاری۔ جور و ستم اور استبداد کو جائز قرار دیتے ہیں۔ چونکہ اس کا یہ فعل مستثنیات میں سے نہیں بلکہ انگلستان اور فرانس کے جرموں کی تکرار یا صدائے بازگشت ہے۔ اس لئے علامہ اقبال اس کو ملزم قرار نہیں دیتے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہوں کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار! تو چھلنی میں چھاج!

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج!

یہ عجائب شعبدے کسی کی ملوکیت کے ہیں
راجدھانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

آلِ سیزر چوب نے کی آبیاری میں رہے
اور تم دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑو بے خراج

برعکس اس کے اس نے اپنی قوم میں عمل اور جدوجہد کی جو روح پھونکی ہے اس پر انہوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی ہے۔ جنگِ عظیم کے بعد گو اٹلی فاتح قوموں کی صف میں تھی مگر جنگ نے اسے بے حد زار و نحیف کر دیا تھا۔ اور جب یورپ۔ ایشیا اور افریقہ کی تقسیم شروع ہوئی تو اس کا منہ بند کرنے کے لئے یار لوگوں نے ایک ہڈی اس کی طرف پھینک دی۔ جسے اپنی گرسنگی کی وجہ سے دبوچنے اور چچوڑنے کے سوائے اس کے لئے کچھ چارہ نہ تھا۔ اگر اس کی سیاسی حالت میں مسولینی کی سحرکاری سے آج انقلاب عظیم پیدا نہ ہوتا تو اس کا شمار دنیا کی تیسرے درجہ کی اقوام میں ہوتا۔ اور اسے انگلستان اور فرانس کے شعبدہ گروں کے ہاتھوں کٹھ پتلی کی طرح ناچنا پڑتا۔ لیکن مسولینی نے اس کی قسمت کا پانسہ بدل دیا۔ اور آج تمام ملک میں ہیجان عمل ہے جس کی وجہ سے اس کے رقیب دانت پیس رہے ہیں۔ لیکن سوائے خاموشی کے ان سے کچھ نہیں بن پڑتا۔

چشمِ پیرانِ کہن میں زندگانی کا فروغ
نوجواں تیرے ہیں سوزِ آرزو سے سینہ تاب

یہ محبت کی حرارت! یہ تمنا! یہ نمود
فصلِ گل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب!

نغمہ ہائے شوق سے تیری فضا معمور ہے
زخمہ ور کا منتظر تھا تیری فطرت کا رباب!

فیضِ یکس ہی نظر کا ہے کرامت کس کی ہے؟ وہ کہ ہے جس کی نگہ مثلِ شعاعِ آفتاب!

اپنی وجوہات کی بنا پر مسولینی نے بھی علاّمہ موصوف سے آفریں حاصل کی۔ اس کے 'جوش کردار' نے فرانس کو سیاسی اقتدار کی چوٹی پر پہونچا دیا تھا۔ عمل کے متعلق سلطان ٹیپو کی وصیت ہر مسلمان کی وردِ زبان ہونی چاہیے۔

تو رہ نوردِ شوق ہے، منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشین ہو تو محمل نہ کر قبول!

اے جوئے آب بڑھ کے ہو دریائے تند و تیز
ساحل تجھے عطا ہو تو ساحل نہ کر قبول!

کھویا نہ جا صنم کدۂ کائنات میں
محفل گداز! گرمیٔ محفل نہ کر قبول!

صبحِ ازل یہ مجھ سے کہا جبرئیل نے
جو عقل کا غلام ہو وہ دل نہ کر قبول!

باطل دوئی پسند ہے حق لاشریک ہے
شرکت میانۂ حق و باطل نہ کر قبول!

عمل اور جد و جہد کے حامی کی حیثیت سے علاّمہ اقبال۔ افلاطون کے فلسفہ سکون اور تصوف کی تعلیم صبر و رضا اور قناعت کے سخت مخالف ہیں۔ اور اس تعلیم کو وہ مسلمانوں کی بے عمل زندگی کا موجب قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک افلاطون کی تعلیم ایک زندہ و بیدار قوم کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتی ہے۔ زندگی کا راز عمل میں ہے اور عمل زندگی میں سختی۔ تنومندی اور جفاکشی پیدا کرتا ہے۔ مگر افلاطونی سکون کاہلی اور بے عملی کی طرف راغب کرتا ہے۔

در صلابت آبروئے زندگی است
ناتوانی۔ ناکسی ناپختگی است

افلاطونیت تن آسانی سکھاتی ہے جو انسان کی تذلیل و تحقیر کا باعث ہوتی ہے۔ مسلمان اس تن آسانی کی وجہ سے آج عرصۂ دار و گیر میں محتاج و خوار ہیں۔

آں جہاں زار از تن آسانی شدی
در جہاں ننگ مسلمانی شدی

از رگِ گل می تواں بستن ترا
از نسیمے می تواں خستن ترا

مگر افسوس مسلمانوں نے اپنی کوتاہ اندیشی سے افلاطونیت کو اکسیرِ حیات سمجھ کر قبول کیا اور اپنی تباہی

وبربادی اپنے ہاتھوں کی۔ اس وجہ سے افلاطون پر علامہ اقبال کا قہر وعتاب فراواں ہے۔ اسے "از گروہ گوسفنداں قدیم" اور "گوسفندے درلباسِ آدم" کا خطاب دے کر اس کی تعلیم کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

گفت سرِّ زندگی در مردن است — شمع را صد جلوہ از افسردن است
کارِ او تحلیلِ اجزائے حیات — قطع شاخ سرو رعنائے حیات
فکرِ افلاطون زیاں را سود گفت — حکمتِ او بود را نابود گفت
بسکہ از ذوقِ عمل محروم بود — جانِ او وارفتۂ معدوم بود
آہوش بے بہرہ از لطفِ خرام — لذتِ رفتار بر کبکش حرام
ذوقِ روئیدن ندارد دانہ اش — از تپیدن بے خبر پروانہ اش

افلاطون کا مسئلہ رعیان ان مردہ دلوں کے لئے جو لذتِ عمل سے بے بہرہ ہیں اور اپنی زندگی تن آسانی کی نذر کر چکے ہیں باعثِ تسکین و اطمینان ہے۔ لیکن جد وجہد کے شیدائی اسے نفرت سے دیکھتے ہیں۔

زندہ جاں را عالمِ امکاں خوش است — مردہ دل را عالمِ رعیاں خوش است

کیونکہ یہ زندگی کے ضعف وانحطاط کا باعث ہے اور دنیا میں کمزوری کی سزا فنا ہے۔

تقدیر کے قاضی کا یہ فتویٰ ہے ازل سے — ہے جرمِ ضعیفی کی سزا مرگِ مفاجات

اس کمزوری نے حبش کو اطالیہ کا چین کو جاپان کا اور ہندوستان کو انگلستان کا شکار بنایا۔ اس لئے علامہ اقبال حکیم نیٹشا کی مانند مسیحی تعلیم کے اس جزو کے قائل نہیں کہ اگر کوئی شخص تمہارے دائیں رخسار پر طمانچہ مارے تو تم اپنا بایاں رخسار اس کی طرف پھیر دو۔ عیسائیوں میں بھی اس تعلیم پر عمل صرف حضرت عیسیٰؑ کی ذات تک محدود رہا۔ ان کے برعکس ان کے پیرو فولادی گھونسے کے قائل ہیں اور اسی کا درس دیتے ہیں۔ افلاطونیت کا چونکہ تصوف پر بہت اثر ہے اس لئے علامہ اقبال اس سے بھی جہاں تک اس کی تعلیم عمل اور جد وجہد کے منافی ہے بیزار ہیں۔ اسلام کے زمانۂ انحطاط میں مسلم مفکروں نے قومی زوال پر

اپنی تسکین کا سامان افلاطونی تعلیم سکون میں پایا۔ بے عملی نے صوفیانہ رضا و تسلیم اور صبر و قناعت کی آڑ لی۔ اور ان کو اخلاقی خوبیاں قرار دے کر ان کی تعلیم شد و مد سے کی گئی۔ جس کے خواب آور اثر نے حالت کو بد سے بدتر کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے اسلام جس نے کسی زمانہ میں اپنے عمل سے دنیا کو اپنا زیر نگیں کر لیا تھا آج اغیار کے آگے سرنگوں ہے۔ جس تگ و دو اور جد وجہد کے علامہ اقبال قائل ہیں صوفی اسے دنیاوی حرص و آز سے تعبیر کرتے ہیں۔ جو ان کے نزدیک بہائم کا خاصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب مسلسل محکومی کی وجہ سے کاہلی اور سستی نے مسلمانوں کے مزاج پر دخل پا لیا تو انہوں نے اس تعلیم کی پناہ لی اور اپنی حالت کو بالکل تباہ و برباد کر لیا۔ اس لئے علامہ اقبال کی بیزاری اس سے بجا ہے۔

یہ حکمتِ ملکوتی یہ علمِ لاہوتی — حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ ذکرِ نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور — تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
یہ عقل جو مہ و پرویں کا کھیلتی ہے شکار — شریک شورشِ پنہاں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی دیا لا الہ تو کیا حاصل — دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

تسلیم و رضا کا جو تصور یار لوگوں نے باندھ رکھا ہے وہ فطرت انسانی کے منافی ہے۔

ہر شاخ سے یہ نکتۂ پیچیدہ ہے پیدا — پودوں کو بھی احساس ہے پہنائے فضا کا!
ظلمت کدہ خاک پہ شاکر نہیں رہتا — ہر لحظہ ہے دانے کو جنوں نشو و نما کا!
فطرت کے تقاضوں پہ نہ کر راہ عمل بند — مقصود ہے کچھ اور ہی تسلیم و رضا کا!
جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے — اے مردِ خدا ملکِ خدا تنگ نہیں ہے

اقبال کے فلسفۂ حیات کی اساس فلسفۂ خودی پر ہے جو ان کے دل و دماغ پر مسلط و حاوی ہے۔ اور جس کی تعریف کے لئے ان کا تمام کلام وقف ہے۔ خودی صوفیانہ انکسار۔ فروتنی۔ گوشہ نشینی اور بے عملی کی ضد ہے۔ خودی پر انسان کی ترقی کا انحصار ہے جب تک کسی قوم کو اپنی قوتوں کا حقیقی احساس نہ ہو جائے وہ کوئی قدم آگے نہیں بڑھا سکتی۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اپنے احساس

فروتنی کا قلع قمع کر کے اپنی قوتوں کا جائزہ لے۔ جو کام ایک قوم کر سکتی ہے وہ دوسری کے لئے ہر طرح ممکن ہے بہ شرطے کہ اس کے لئے صحیح طریق پہ کوشش کی جائے۔ ایک محکوم قوم میں اپنی کمزوریوں کا احساس اس شدت سے ہوتا ہے کہ وہ اپنی خوبیوں کو بھی بھلا دیتی ہے۔ لیکن مناسب یہ ہے کہ کمزوریوں کے ساتھ ساتھ اپنی خوبیوں کا بھی جائزہ لیا جائے اور عمل سے کمزوریوں کو رفع کرنے اور خوبیوں کو بڑھانے کی کوشش کی جائے۔ جرمنی۔ اٹلی اور ٹرکی کی حالت جنگ عظیم کے بعد ناگفتہ بہ تھی۔ بیس سال کے قلیل عرصہ میں جو ترقی انہوں نے کی ہے اور جو طاقت حاصل کی ہے وہ محض اپنی فطری قوتوں کے بھروسہ پہ جد و جہد کرنے کی وجہ سے تھی۔ جس قوم میں زندہ رہنے کا ولولہ ہے اور جسے اپنی طاقت کا احساس ہے وہ خواہ مغلوب ہی کیوں نہ ہو کبھی کسی دنیاوی مشکل کے آگے سر خم نہیں کرے گی۔ اس کا قدم ہمیشہ آگے بڑھتا ہے خواہ چپے چپے پر سو سو ٹھوکر کھانی پڑے۔ لفظ 'ناممکن' کبھی اس کی زبان پر نہیں آتا جس طرح نپولین کہتا تھا کہ لفظ 'ناممکن' میری ڈکشنری میں نہیں۔ عمل اور جد و جہد سے خفتہ قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اور جو کام ناممکن معلوم ہوتا ہے وہ آسان ہو جاتا ہے۔ لیکن جو قوم اپنی کمزوری کا یقین کر کے ہمت ہار دے اسے کوئی دنیاوی طاقت تباہی سے نہیں بچا سکتی۔ خودی سے مراد خود شناسی ہے۔ اور خود شناس شخص کبھی دوسرے کے آگے سر تسلیم خم کرنے کو گوارا نہیں کرتا۔ اقبال کا یقین ہے کہ دنیائے اسلام کے زوال کی ذمہ وار بہت حد تک ناخود شناسی ہے۔ مسلمانوں میں اپنے آباؤ اجداد کی خوبیاں موجود ہیں۔ لیکن اپنے نامساعد حالات و نواحیات کی وجہ سے وہ انہیں محسوس نہیں کرتے یا ان کے محسوس کرنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اگر وہ ان سے کام لیں تو ان کے ادبار کا دفع ہونا ہر طرح ممکن ہے۔ خودی کیا ہے؟ اس کی وضاحت بار بار کی گئی ہے۔

یہ موجِ نفس کیا ہے تلوار ہے	خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات	خودی کیا ہے بیداریِ کائنات
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک	من و تو میں پیدا من و تو سے پاک

ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

خودی کا تقاضا ہے کہ انسان اپنے جوہر دنیا پر آشکار کرے۔ محض نمائش کی خاطر نہیں بلکہ اظہارِ حقیقت کی خاطر۔

وانمودن خویش را خوئے خودی است — خفتہ در ہر ذرّہ نیروئے خودی است

جس زندگی میں "ذوقِ نمود" نہ ہو وہ بہ منزلہ مرگ ہے۔

بے ذوقِ نمود زندگی موت — تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت — پربت ضعفِ خودی سے رائی

خودی کی زندگی کیا ہے؟

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی — نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب — خودی ہو زندہ تو کہسارِ پرنیاں و حریر
نہنگ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد — نہنگِ مردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

محکومی میں انسان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا کر ان کی مدد کا طلب گار رہتا ہے۔ اور اپنی خودداری کو تباہ کرتا ہے۔ دنیائے اسلام کو خطاب ہے۔

اے فراہم کردہ از شیراں خراج — گشتۂ روباہ مزاج از احتیاج
خستگی ہائے تو از ناداری است — اصلِ دردِ تو ہمیں بیماری است
از سوال آشفتہ اجزائے خودی — بے تجلی نخلِ سینائے خودی
چوں حباب از غیرتِ مردانہ باش — ہم بہ بحر اندر نگوں پیمانہ باش
خودی کے نگہباں کو ہے زہرِ ناب — وہ ناں جس سے جاتی رہے اس کی آب
وہی ناں ہے اس کے لئے ارجمند — رہے جس سے دنیا میں گردن بلند

خودی شیرِ مولا جہاں اس کا صید　　زمیں اس کی صید آسماں اسکا صید

علامہ اقبال کے مطابق حقیقی خودی کا آج تمام جہان میں فقدان ہے۔ اور مغرب اس سے اسی قدر دور ہے جتنا کہ مشرق۔

خودی کی موت سے مغرب کا اندروں بے نور　　خودی کی موت سے مشرق ہے مبتلائے جذام!
خودی کی موت سے روحِ عرب ہے بے تب و تاب　　بدن عراق و عجم کا ہے بے عروق و نظام!
خودی کی موت سے ہندی شکستہ بال و پر　　قفس ہوا ہے حلال اور آشیانہ حرام!
خودی کی موت سے پیرِ حرم ہوا مجبور۔　　کہ بیچ کھائے مسلماں کا جامہ احرام!

یورپ مشرق کا ایسا ہی محتاج و دست نگر ہے جیسا کہ مشرق مغرب کا۔

مانگنے والا گدا ہے صدقہ مانگے یا خراج　　کوئی مانے یا نہ مانے میر و سلطاں سب گدا

فقر اور خودی میں گہرا تعلق ہے۔

چڑھتی ہے جب فقر کی ساں پر تیغِ خودی　　ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کارِ صد سپاہ

مگر علامہ اقبال صوفیانہ فقر کے قائل نہیں۔

میں ایسے فقر سے اے اہلِ حلقہ باز آیا　　تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری
نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کیلئے　　وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

خودی کے لئے لازم ہے کہ قوم اپنے سامنے ایک نصب العین رکھے جس کے حصول میں وہ شب و روز کوشاں رہے۔ آرزو دلوں میں گرمی اور ارادوں میں جوش برقرار رکھتی ہے۔ اگر آرزو مردہ ہو تو زندگی محض تسلسلِ تنفس ہے۔ زندگی نہیں۔ جس قوم یا فرد کے آگے کوئی نصب العین نہیں وہ عمل اور جد و جہد کو ایک مصیبت گردان کر اس سے گریز کرتا ہے۔ لہٰذا آرزو کو سینے میں ہمیشہ زندہ رکھنا زندگی کا ثبوت دینے کے لئے ضروری ہے۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　اصلِ او در آرزو پوشیدہ است

آرزو دردلِ خود زندہ دار تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار

آرزو ہنگامہ آرائے خودی موجِ بیتابے زدریائے خودی

ما زتخلیقِ مقاصد زندہ ایم از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

خودی کو عشق ومحبت سے استحکام واستواری حاصل ہوتی ہے۔

نقطۂ نورے کہ نامِ او خودی است زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است

از محبت مے شود پائندہ تر زندہ ترسوزندہ ترتابندہ تر

از محبت اشتعالِ جوہرش ارتقائے ممکناتِ مضمرش

اوراس کی تربیت اطاعت۔ضبط نفس اور نیابت الٰہی سے۔

فلسفہ خودی کے ساتھ علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ بےخودی بھی پیش کیا ہے۔جس کا مقصد افراد کو ملّت میں شامل ہونے کی دعوت دیتا ہے۔انفرادی حیثیت میں انسان کی دنیا میں کوئی قدر وقیمت نہیں اور اپنی جبلّی کمزوری کی وجہ سے وہ جلد حوادث کا شکار ہوجاتا ہے۔لیکن جب کئی افراد مل کر ایک جماعت بنالیں تو اپنی یکجہتی۔اتفاق اور متحدہ طاقت سے دنیا کو مرعوب کر سکتے ہیں۔اس لئے ہر فرد کے لئے لازم ہے کہ وہ 'بےخود' ہوجائے اور اپنی شخصیت کو قوم وملّت میں مدغم کردے اور اس سے بالکل یک جان ہوجائے۔ایسے افراد کا چھوٹا سا گروہ بھی دنیا میں اپنے عزم واستقلال اور اتفاق سے ایک انقلاب پیدا کردیتا ہے۔طارق بن زید کے ہمراہ اندلس کی دل بادل افواج کے مقابلہ میں محض مٹھی بھر سرفروشان اسلام تھے مگر انہوں نے اس ملک کو فتح کرکے اپنے جانشینوں کے حوالے کیا اور اس پر مسلمان سات سو سال تک حکمراں رہے۔افراد کی کشاکش اقوام کی تباہی وبربادی کا باعث ہوتی ہے۔جس کی صدہا مثالیں تاریخ میں موجود ہیں۔اسلام کی تباہی اسی کے ہاتھوں ہوئی۔ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کی بربادی کا باعث یہی تھی۔اورنگ زیب کے بعد جب مرکزی حکومت کمزوری کا شکار ہوئی تو ہر صوبے میں تو کجا ہر شہر پر کوئی نہ کوئی حکمراں بن بیٹھا جس سے جماعت کی شیرازہ بندی ختم ہوگئی۔اس انفرادی کشاکش د

انتشار کو روکنے کے لئے علامہ اقبال بے خودی کی تعلیم دیتے ہیں تاکہ افراد اطاعت۔ضبط نفس۔ اور محبت قومی سے اپنی خودی کو مستحکم کرکے اپنے آپ کو جماعت میں گم کر دیں۔اور اس میں اس طرح پیوست ہو جائیں کہ پھر ترک و تتار۔ہندی و افغان اور مصری و حجازی کی کوئی تفریق نہ رہے۔اس میں ان کی اپنی بہتری بھی ہے اور دنیا کی فلاح بھی۔

فرد را ربط جماعت رحمت است　　جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش　　رونقِ ہنگامہ احرار باش
حرز جاں کن گفتۂ خیر البشر　　ہست شیطاں از جماعت دور تر
فردے گیرد ز ملت احترام　　ملت از افرادے یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود　　قطرۂ وسعت طلب قلزم شود
پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم　　ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم

ملت اور قوم ایسے ہی افراد کا مجموعہ ہے جو ہزار صد ہزار قالب لیکن یک دل و یک جان ہوں۔ جب ایک کا درد سب جماعت کا دوا اور ایک کی مسرت تمام جماعت کی مسرت ہو۔اپنے وعظ و فلسفے سے علامہ اقبال تمام عالم اسلام کو ایسی ہی جماعت میں منظم کرنا چاہتے ہیں۔عالم اسلام میں یکجہتی کا یہ امکان اس کی تعلیم مساوات میں موجود ہے۔

نے افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک شاخساریم

مسلمانوں کی باہمی پرخاش و کشاکش ان سے مخفی نہیں اور اس کے استیصال کا انہوں نے عزم بالجزم کر لیا ہے۔

اگر آپس میں لڑنا آج کل کی ہے مسلمانی　　مسلمانوں کو آخر نا مسلماں کر کے چھوڑوں گا
پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کو　　اگر مشکل ہے اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑوں گا

حقیقت یہ ہے کہ فلسفہ خودی اور بے خودی میں نہ ہی صرف علامہ اقبال کے احساسات وجذبات اور تخیلات اوران کی تعلیم کا نچوڑ ہے بلکہ اس میں عالم اسلام کے مرض کا علاج موجود ہے۔ اگر وہ اِس اکسیر کو قبول کرے تو اس کا احیا کچھ مشکل نہیں۔ ان کی رجائیت اس معاملے میں بہت زبردست اور محکم ہے۔

سیاسیات عمل کا میدان ہونے کی وجہ سے علامہ اقبال کی تعلیم کا ایک اہم جزو ہے۔ اس کے متعلق ان کے خیالات نے ارتقائی منازل طے کی ہیں۔ جس کی وجہ سے بعض اغیار نے ان پر سیاسی تعالی کا بینگن ہونے کا الزام لگایا ہے۔ ہندو نیشنلسٹ انہیں پین اسلامزم کا مجرم گردانتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس مسئلے میں ان کا دل بہت عرصہ تک مختلف حالات وتاثرات کی جولانگاہ بنا رہا ہے۔ اور دنیا کی سیاسیات حاضرہ نے انہیں مبتلائے حیرت واستعجاب رکھا۔ مدت کے مطالعہ۔ مشاہدہ اور غور وفکر کے بعد ان کے خیالات ایک مرکز پر جمع ہوئے اور ایک نظریے کی صورت میں انہوں نے تشریح پائی۔ انگلستان جانے سے قبل وہ وطنیت کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ اور وطن کا راگ گاتے تھے۔ اور بحیثیت ہندوستانی کے ان کا وطن ہندوستان تھا۔ ان کے وطنی جذبات 'ترانہ ہندی' اور 'ہندوستانی بچوں کا قومی گیت' میں ظاہر ہوئے۔ یورپ میں جب انہوں نے وطنیت کے تاریک وہیبت ناک پہلو کا مشاہدہ کیا تو ان کی طبیعت اس سے متنفر ہوگئی۔ اس 'وطنیت' کی برکت سے گزشتہ جنگ عظیم میں لکھوکھا نوجوان لقمۂ اجل ہوئے۔ اور لکھوکھا زخمی۔ لیکن باوجود اس عظیم اتلاف جان ومال کے یورپ کی طاقتوں کے سر پر اس کا بھوت سوار ہے۔ اور برطانوی۔ فرانسیسی۔ جرمن۔ روسی۔ رُومانوی۔ اور اطالوی سپاہی اس کی قربانگاہ پر دوسروں کا سر چڑھانے کے لئے شمشیر بدست ہیں اور عنقریب دنیا کی بنیادیں ایک اور جنگ سے جو گزشتہ جنگ سے کہیں مہیب وہولناک ہوگی ہلجائیں گی۔ اس 'وطنیت' کی بنیاد جبر واقتدار غصب۔ دستبرد۔ لوٹ کھسوٹ اور ظلم واستبداد پر ہے۔ ہر قوم یہ چاہتی ہے کہ دوسری کا قلع قمع کرکے خود دنیا پر قابض ہوجائے۔ اسی لئے آج تمام یورپ ایک مسلح کیمپ معلوم ہوتا ہے۔

علامہ اقبال اگر اس 'وطنیت' سے منحرف ہوگئے ہیں تو یہ ان کی وسعت اخلاق کی دلیل ہے نہ کہ تعصب و تنگ نظری کی۔ اس کے علاوہ ان کی فکر وسعت پسند 'وطنیت' کی تنگ جغرافیائی حدود میں محدود رہنے کو گوارا نہیں کرسکتی تھی۔ اس لئے وہ 'ہندوستانیت' کے تنگ دائرے سے نکل کر 'مسلمانیت' کے وسیع حلقے میں داخل ہوئے۔ مسلمان کا وطن تمام کرۂ ارض ہے۔ اور جہاں جہاں مسلمان مجاہد کا خون گرا ہے وہ اس کا گھر ہے۔ اس لئے وہ تمام ملکی تفریق کو مٹا کر تمام اقوام اسلام سے ایک مہتم بالشان ملتِ قومی کی تعمیر کرنا چاہتے ہیں۔

نے افغانیم و نے ترک و تتاریم　　چمن زادیم و از یک شاخ ساریم
تمیز رنگ و بو بر ما حرام است　　کہ ما پروردۂ یک شاخ ساریم
ہنوز از بند آب و گل نہ رستی　　تو گوئی رومی و افغانیم من
من اوّل آدم بے رنگ و بویم　　از اں پس ہندی و تورانیم من

'وطنیت' انسان کو ایک محدود حلقے میں پا بجولاں کر کے اس کی نظر کو تنگ اور اس کی ذہنیت کو کج کر دیتی ہے۔ اس لئے مسلمانوں کے لئے ضروری ہے کہ اس تنگ دائرے سے نکل کر ایک نئی دنیا تعمیر کریں۔ اِس 'وطنیت' کی برکتیں یہ ہیں۔

اقوام جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے　　تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے　　کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اقبال کے نزدیک سیاست کا مقصد اولیٰ بنی نوع انسان کی خدمت ہے نہ کہ تباہی۔ اس کے بنیادی اصول انصاف۔ حقوق العباد۔ اور مساوات اقوام و افراد ہونے چاہئیں۔ مگر موجودہ سیاست میں ان کا کلیہ فقدان ہے۔ چونکہ یہ اصول اسلام کا جزو جان ہیں اس لئے وہ ایک ہمہ گیر اسلامی سلطنت

میں دنیا کی سلامتی اور نجات دیکھتے ہیں۔ اور ایک دیسی پالیٹی (Polity) کی بنیاد رکھنا چاہتے ہیں جو نسل۔ قوم اور رنگ کے کریہہ امتیازات سے مبرّا اور وطن کی جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہو۔ اور جس کا مقصد بنی نوع انساں کی حقیقی فلاح و بہبود اور ترقی ہو۔ اس نظام سلطنت کا امکان چونکہ عالم اسلام میں انہیں ملتا ہے اس لئے پہلے وہ اس کو سنوارنے کی فکر میں ہیں۔ اور بار بار تمیز رنگ و خون کو دور کرنے کی ہدایت کرتے ہیں۔

جو کرے گا امتیازِ رنگ وخوں مٹ جائیگا — ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
بتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوگا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

مذہب کی اصل منشا خلق خدا کی جسمانی روحانی حفاظت ہے۔ اس لئے زمانہ قدیم میں امورِ سلطنت کی باگ مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں ہوا کرتی تھی۔ اور اس بیسویں صدی میں بھی جب کہ سلطنت کو کلیسا سے جدا کر دیا گیا ہے ہر جگہ بادشاہ کو محافظ دیں' کا لقب دیا جاتا ہے۔ سیاست جب تک مذہب کے تابع رہی اور مذہب کے اصولوں کی نیک نیتی سے پابندی کی گئی تو خلق خدا نے ہر طرح امن وانصاف کی فضا میں زندگی بسر کی۔ اسلام میں اس کی زبردست نظیر خلفائے کرام کی حکومتوں میں موجود ہے۔ ہر فرض شناس اسلامی حکمراں کی یہ زبردست خواہش رہی ہے کہ خلق خدا کی خدمت کر کے خداوند کریم کی حضور میں سرخرو ہو۔ بلا تفریق مذہب و ملت خلق خدا سے انصاف کیا جاتا تھا۔ اور مسلمانوں سے کہیں بڑھ کر غیر اقوام کے لوگ اس فیض سے متمتع ہوتے۔ دنیا کی فلاح و بہبود اس امر کی متقاضی ہے کہ سیاست مذہب کے تابع فرماں رہے۔ لادین سیاست دنیا کی تباہی کا باعث ہو رہی ہے۔

میری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادیں — کنیزِ اہرمن و دوں نہاد و مردہ ضمیر
ہوئی ہے ترکِ کلیسا سے حاکمی آزاد — فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر
متاعِ غیر پہ ہوتی ہے جب نظر اسکی — تو ہیں ہراولِ لشکر کلیسا کے سفیر
جلالِ بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو — جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

'وطنیت' ایک سیاسی ڈھونگ ہے جو انسان کے فطری احساسات وجذبات ہمدردی وباہمی میل جول کے منافی ہے۔ یہ تنگ نظری اور تعصب کو فروغ دے کر بنی نوع انسان کو آمادۂ پیکار رکھتی ہے۔ بین الاقوامی رقابت۔ مناقشت۔ بدگمانی اور بدامنی اسی کے کرشمے ہیں۔ یہ ایک طلسم خردسوز ہے جس کے ذریعہ سے عیاراں مغرب مشرق میں تفرقہ اندازی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ ایک مردمسلمان کا وطن 'کلوخ وسنگ وخشت' سے بالاتر اور جغرافیائی حدود سے بے نیاز ہے۔

می نگنجد آنکہ گفت اللہ ہو — در حدودِ ایں نظامِ چارسو
جان نگنجد در حیات اے ہوشمند — مرد حر بیگانہ از ہر قید و بند

علامہ اقبال جمہوریت سے اتنے ہی بیزار ہیں جتنے 'وطنیت' سے۔ انقلاب فرانس سے دنیا کی ہزارہا امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن وہ سب کی سب پامال ہو گئیں۔ جمہوریت فرانس استبدادیت میں آج برطانوی۔ ایطالوی اور جاپانی ملوکیت کے ہمدوش ہے۔ دنیا کی آزادی کی پاسباں ہونے کی بجائے اس نے کئی اقوام کو بہ جبر غلامی کا طوق پہنا رکھا ہے۔ اور استبداد کی ایک نئی شکل ہو کر رہ گئی ہے۔ اس سے کسی مساوات۔ انصاف کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی — بہ موراں شوخیٔ طبع سلیمانے نمی آید
گریز از طرزِ جمہوری غلامِ پختہ کارے شو — کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانے نمی آید

اوس نے سالہا سال کی جد و جہد کے بعد ایک نئی جمہوریت کی بنا ڈالی۔ لیکن وہ بھی شخص جبر و اقتدار کی صورت حاصل کر رہا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے مہینے کئی بدنصیبوں کے لاشے 'تحفظ امن عامہ' کے بہانے سے اس کی قربان گاہ پر چڑھائے جاتے ہیں۔ امریکہ کی جمہوریت 'سگ زرد برادر شغال' کی مثال رکھتی ہے۔ فلپائن کے باشندوں پر جو مظالم توڑے گئے انھوں نے تاریخ عالم میں ایک خونچکاں داستاں کا اضافہ کیا ہے۔ الغرض اب تک جمہوریت نے ان زریں اصولوں کی پیروی سے احتراز کیا ہے جن پر اس کی بنیاد ہے۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام　　جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب　　تو یہ سمجھا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلسِ آئین و اصلاح و رعایات و حقوق　　طبِ مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری
اس سرابِ رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو　　آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

جمہوریت کا دعوےٰ ہے کہ بذریعہ انتخاب ملک کے بہترین دماغوں کو سلطنت کا کام چلانے کے لئے اکٹھا کیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اکثر وہ لوگ منتخب ہو جاتے ہیں جن کی جیب پُرا ور دماغ خالی ہوتے ہیں۔ جس جماعت میں ایسے لوگ شامل ہوں اسے اگر جماعت "دو صد خر" کہا گیا ہے تو بالکل بجا ہے۔

اِس راز کو اک مردِ فرنگی نے کیا فاش!
ہر چند کہ دانا اسے کھولا نہیں کرتے
جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے

یورپ نے جمعیت اقوام کے ذریعہ اپنی مشکلات کو حل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے بانیوں نے دنیا کو اس کے متعلق بہت سبز باغ دکھائے۔ لیکن چند ہی سال میں اس کی قلعی کھل گئی۔ حقیقت میں چند ٹھگوں نے شریفوں کے لباس میں کمزوروں کو لوٹنے اور ان کے مال و متاع کو ہضم کرنے کے لئے یہ کلب قائم کی تھی۔ اور خود ساختہ قوانین سے اپنی لوٹ مار کو قانونی رنگ سے جائز کرنا چاہتے تھے۔ قضیہ فلسطین۔ حبش پر ایطالوی قبضہ اور جاپان کی چین پر یورش اس کے طرزِ عمل کی بہترین نظیریں اور اس کی ناکامی کی دلیل ہیں۔ اقبال کی مفصلہ ذیل رباعی اس کے متعلق حفظ کرنے کے قابل ہے۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزمِ کہن　　دردمنداں جہاں طرح نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند ۔۔۔ بہرِ تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

بجائے بین الاقوامی قضیوں کا تصفیہ کرنے کے یہ باہمی مناقشت کا اکھاڑہ بن گئی ہے ۔ اور اس لئے اس کا خاتمہ قریب معلوم ہوتا ہے ۔

بیچاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے ۔۔۔ ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے
تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن ۔۔۔ پیرانِ کلیسا کی دعا ہے کہ یہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرکِ افرنگ ۔۔۔ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

جمہوریت کے ساتھ اشترکیت اور ملوکیت بھی علامہ اقبال کے زیر عتاب ہے ۔

ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب ۔۔۔ ہر دو یزداں ناشناس آدم فریب
زندگی ایں را خروج آں را خراج ۔۔۔ درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست ۔۔۔ آں برد جاں را ز تن ناں را ز دست
غرق دیدم ہر دو را در آب و گل ۔۔۔ ہر دو را تن روشن و تاریک دل

زندگانی سوختن یا ساختن
در گلے تخمِ دلے انداختن ۔

ایشیائی شاعر زاہد خشک مزاج ۔ محتسب ۔ اور ملا سے ہمیشہ بیزار رہا ہے ۔ ان سے یہی کد علامہ اقبال کو ودیعت ہوئی ہے مگر ان کی بیزاری کی وجوہ مختلف ہیں ۔ وہ عمل کے شیدائی اور مبلغ ہیں ۔ مگر ملا اس کے برعکس اپنی تعلیم سے عمل کے راستے میں روڑے اٹکاتا ہے ۔ یا ایسے عمل کی تعلیم دیتا ہے ۔ جو حقیقی ترقی کے منافی ہے ۔ اور تحقیق و تجسس کا مخالف ہے ۔ خود کور ذوق ہے اور لوگوں کو ذوق عمل سے محروم رکھنا چاہتا ہے ۔ مگر اس کا سب سے عظیم گناہ تفرقہ اندازی ہے ۔ بہ حیثیت مذہبی خادم کے اس کا فرض تھا کہ مسلمانوں کے باہمی تنازع کا خاتمہ کر کے ملت کی شیرازہ بندی کرتا ۔ لیکن اس نے اس کے برعکس کتاب ملت کا ورق ورق الگ کر دیا ۔ ترکی ۔ ایران ۔ افغانستان اور ہندوستان کے

کور باطن و بے بصیرت ملاؤں نے اپنی چیرہ دستیوں سے مسلمانوں کا جو حشر کیا اس کی داستان نہایت غمناک و مایوس کن ہے۔ فلک عطارد میں (جاوید نامہ) سعید حلیم پاشا کی روح ان کی کارستانیوں کو یوں بیان کرتی ہے۔

دینِ حق از کافری رسواتر است — زانکہ ملاّ مومنِ کافر گر است!
شبنمِ ما در نگاہِ ما یم است — از نگاہِ او یمِ ما شبنم است!
از شگرفیہائے آں قرآں فروش — دیدہ ام روح الامیں را در خروش!
زانسوئے گردوں دلش بے گانۂ — نزدِ او ام الکتاب افسانۂ
بے نصیب از حکمتِ دینِ نبی — آسمانش تیرہ از بے کوکبی
کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد — ملت از قال و اقولش فرد فرد!
مکتب و ملاّ و اسرارِ کتاب — کور مادر زاد و نورِ آفتاب!

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ ملاّ فی سبیل اللہ فساد

مسلمانوں کے لئے ملاّ کا وجود ان کی سیاسی غلامی۔ دنیاوی مفلسی اور روحانی ناداری کا باعث ہے اور منجملہ دیگر اسباب کے ان کی ہلاکت کا موجب ہے۔

آنکہ گوید لا الہ بے چارہ ایست — فکرش از بے مرکزی آوارہ ایست
چار مرگ اندر پے ایں دیر میر — سود خوار و والی و ملاّ و پیر

سود خوار بنیا۔ ظالم و بے انصاف حکمراں۔ کور ذوق ملاّ اور گمراہ کن پیر مسلماں کی تباہی میں برابر حصہ رکھتے ہیں۔

ملاّ کا دوسرا گناہ کور ذوقی ہے۔ اس میں حقیقی حبِ ایمان نہیں اور اپنی کور ذوقی کی وجہ سے اس کی حقیقت کو پہچاننے سے قاصر ہے۔ مذہب اس کے لئے محض شکم پروری کا وسیلہ ہے۔ اس کی

ریاضت خلوص سے اس طرح خالی ہے جس طرح اس کا دماغ علم سے۔ اس کا ذکر محض تسبیح کے دانوں کی گنتی اور اس کی نماز، ورزش جسمانی جس سے روح کو کچھ تعلق نہیں۔ اس کی روح مذہب کی حقیقت کے جلوے سے بے بہرہ ہے۔

عجب نہیں کہ خدا تک تیری رسائی ہو — تیری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تیری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام — تیری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام
الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن — ملاّ کی اذاں اور مجاہد کی اذاں اور
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں — کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

ملاّ اور مردِ آزاد کے نکتۂ نظر میں بعد المشرقین ہے۔

جنّت ملاّ مے و حور و غلام — جنّت آزادگاں سیرِ دوام
جنّت ملاّ خور و خواب و سرود — جنّت عاشق تماشائے وجود
حشر ملاّ شق قبر و بانگِ صور — عشق شور انگیز خود صبح نشور

'ملاّ اور بہشت' کی نظم میں علاّمہ اقبال نے ملاّ کی بابت اپنی رائے کو واضح کر دیا ہے۔

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبط سخن کر نہ سکا — حق سے جب حضرت ملاّ کو ملا حکم بہشت!
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف — خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت!
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقوال — بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت!
ہے بد آموزی اقوام و ملل کام اس کا — اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت!

مسلمانوں کی تباہی میں پیر ملاّ کے ہمدوش ہے۔ ایک بانی فساد ہے اور دوسرا گمراہ کن۔ پیر نے بھی مذہب کو اپنے نفسانی اغراض و مقاصد کے حصول کا ایک وسیلہ بنا رکھا ہے۔ بلکہ بسا اوقات وہ اپنی نازیبا حرکات سے ملاّ کو مات کرتا ہے۔ ملاّ بے چارہ مفلس و تہیدست ہوتا ہے۔ مگر پیر کی جیب مریدوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سے پر ہوتی ہے۔ اور وہ اپنی زندگی بعض اوقات اسی طمطراق سے گذارتا ہے

جس کی متحمل اس کی مذہبی حیثیت ہرگز نہیں ہوسکتی۔ وہ اپنے مریدوں سے بڑھ کر زندانِ معصیت میں گرفتار ہوتا ہے اور راہبری کرنے کے بجائے راہزنی کرتا ہے۔

پنجاب کے لوگ پیر پرستی میں مبتلا ہیں اور پیر انگریز پرستی میں۔ ان افسوس ناک حالات کو علامہ اقبال نے نہایت دلچسپ پیرائے میں اپنی نظم موسومہ "پنجاب کے پیرزادوں سے" میں ادا کیا ہے۔ ملا و پیر کے ساتھ انہوں نے مجاور و متولی کو بھی ہدفِ لعنت بنایا ہے کیونکہ یہ سب کے سب دین فروش ہیں اور قوم و ملت کی ناموس کی قبا ان کے ہاتھوں تار تار ہے۔

اقبال کیا ہے؟ اس کا جواب چند الفاظ میں دینا ناممکن ہے۔ کوئی اسے شاعر کہتا ہے۔ کوئی فلسفی۔ لیکن درحقیقت وہ تعریف کی لفظی حد بندی سے بالاتر ہے۔ اس کے احساسات و جذبات۔ فہم و ادراک۔ فلسفے اور خیالات کی حد بندی لفظی ترکیبوں سے نہیں ہوسکتی۔ وہ مردِ خود شناس ہے جسے ظاہری نام و نمود کی مطلق پرواہ نہیں۔ وہ اس خودی۔ فقر۔ استغنا۔ رواداری۔ حق شناسی۔ آزادمنشی کا زندہ نمونہ ہے جس کی وہ تبلیغ کرتا ہے۔ اس کا پیغام۔ پیغامِ حیات ہے اور اس کا کلام حقائقِ زندگی و معرفت کا گنجینہ۔ وہ عمل کا شیدائی اور کردار کا متوالا ہے۔ مگر تعجب کی بات یہ ہے کہ خود اس کی اپنی زندگی اس عمل سے دور ہے۔ وہ عمل کی تبلیغ کرتا ہے اور خود سکون پر کاربند ہے۔ کیوں؟ کیا اس لئے کہ اس کے قول و فعل میں فرق ہے؟ اس لئے کہ اس کی تعلیم خلوص سے بے بہرہ ہے؟ نہیں۔ اس لئے کہ اس کی حیثیت ایک سپہ سالار یا قائد کی ہے جو خود ایک جگہ ساکن رہ کر تمام سپاہ کی نقل و حرکت کا انتظام کرتا ہے۔ اس کے کلام نے کیا معجزے دکھائے ہیں؟ اس کا جواب خود اس کے الفاظ میں دینا مناسب ہے۔

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا ۔۔۔ یہ اک مردِ تن آسان تھا۔ تن آسانوں کے کام آیا

کی حق سے فرشتوں نے اقبال کی غمازی ۔۔۔ گستاخ ہے کرتا ہے فطرت کی حنا بندی!

خاکی ہے مگر اس کے انداز ہیں افلاکی ۔۔۔ رومی ہے نہ شامی ہے کاشی نہ سمرقندی!

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اسنے ۔۔۔ آدم کو سکھاتا ہے آدابِ خداوندی!

نوا مستانه در محفل زدم من	شرارِ زندگی بر گِل زدم من
دل از نورِ خرد کردم ضیاگیر	خرد را بر عیارِ دل زدم من

عجم از نغمه هائے من جواں شد	ز سودایم متاعِ او گراں شد
هجومے بود ره گم کرده در دشت	ز آوازِ درایم کارواں شد

عجم از نغمه ام آتش بجاں است	صدائے من درائے کارواں است
حدی را تیز تر خوانم چو عرفی	که ره خوابیده و محمل گراں است

ز جانِ بے قرار آتش کشادم	دلے در سینۂ مشرق نهادم
گلِ او شعله زار از نالۂ من	چو برق اندر نهادِ او فتادم

رگِ مسلم ز سوزِ من تپید است	ز چشمش اشکِ بیتابم چکید است
هنوز از محشرِ جانم نداند	جهاں را با نگاهِ من ندید است
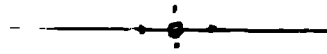
"پیغامِ حقیقت"

محمد یوسف رضا صاحب بدایونی

جمیعِ ہند کی آشفتہ حالی — "غدر" کے بعد سے ناگفتہ بہ تھی
مسلمانوں کی حالت نحس تر تھی — ابھی برہم ہوئی تھی بزم ان کی
دماغوں میں گذشتہ شان و شوکت — نظر میں نقشۂ دورِ حکومت!
وہی اطوار تھے، عادت وہی تھی — عنانِ سلطنت گو چھن گئی تھی!
مخالف تھا ہر اک اپنا پرایا — سروں پر نکبت و ذلت کا سایہ!
مگر نیت ابنائے زمن کی — عناد آمیز خوا اہلِ وطن کی!

یہ کیفیت اگر پیشِ نظر ہو
نہ کیونکر قلب شاعر نوحہ گر ہو؟

یہ باعث تھا جو حالی نوحہ خواں تھا — انہیں جذبات کا وہ ترجماں تھا
زوالِ قوم پر سرفِ بکا تھا — ہر اک شعر اس کا "قومی مرثیہ" تھا!

پھر اس کے بعد آیا وہ زمانہ — کہ حالت جس میں تھی امید افزا
ہوئی تب فکر یہ اربابِ دل کو — بھلا دیں ہنس کے رنجِ جاں گسل کو
کہا دل نے یہ معنی گستروں سے — نکالو کام "شیریں نشتروں" سے!
جو دل پژمردہ ہوں بھڑکا دو اُن کو — مزاحاً چھیڑ کر چونکا دو اُن کو

رَوِش یہ اکبرِ مرحوم کی تھی
مزاح و طنز میں تھی نکتہ چینی!

مگر قدرت نے جب یہ حال دیکھا — کہ مُسلم خوابِ غفلت سے نہ چونکا
دعا خالی گئی ہر "اہلِ دل" کی — نہ کارآمد ہوئی تدبیر کوئی
صدا یہ عالمِ بالا میں گونجی — کہ "مرضی ہے یہ ربُّ العالمین کی
کہ ہو تخلیق ایسا انقلابی — کرے جو دُور آثارِ خرابی
نفس میں جس کے ہو آتش نوائی — سخن میں جس کے ہو معجز نمائی
مسلمانوں کو جو ہوشیار کر دے — دلوں کو جذبۂ قومی سے بھر دے
بھرا ہو یہ اثر اُس کے قلم میں — کہ برپا کر دے محشر ایک دم میں
اثر ہو یہ زبانِ سحر فن میں — حرارت پھونک دے ہر موئے تن میں
نکالے کام نشتر کا زباں سے — رگِ خوابیدہ کو بیدار کر دے!"

"بنایا جائے جب اُس کا ہیولیٰ — خلاصہ ہو کمالاتِ جہاں کا
حکیمانہ رَوِش ہو نیٹشے کی — ہو گیٹے کے تخیّل کی بلندی
قلم میں حق نگاری شکسپیر کی — بیاں میں کیٹس کی رنگیں طرازی
مُجسم شعریت ہو مثلِ شیلی — چمک آہ و فغاں میں بائرن کی
اثر سعدی کا، فردوسی کا انداز — نوائے دل نشیں میں میر کا ساز
محاکاتِ انیس و سُوزِ حالی — اسد کی آسماں رس فکرِ عالی"

مُرتّب جب ہوئے یہ سب عناصر — ہوئی تخلیق جسم و روحِ شاعر
ملائک بہرِ نظارہ جو آئے — معاً فق ہو گئے حیرت سے چہرے
کیا یہ عرض ربُّ العالمین سے: — کہ "یہ تشویش ہے دل کو ہمارے

"بَلا کا سحر ہے اس کی زباں میں — وُفورِ انقلابیت بیاں میں!
"کہیں یہ منقلب عالم نہ کر دے! — جہاں کو درہم و برہم نہ کر دے!"
جواب آیا کہ "تم واقف نہیں ہو! — یہ بھیجا جائے گا ہندوستاں کو
وہاں مسلم ہے محوِ خوابِ غفلت — تن آسانی میں ہے مشہورِ خلقت
غریقِ نکبت و افلاس ہے وہ! — خدا کے فضل سے بے آس ہی وہ!
یہ بھیجا جا رہا ہے اس غرض سے — کہ اُس کو خواب سے بیدار کر دے!"

یہ ہے اقبالؔ کی خلقت کی غایت
کلام اُس کا ہے "پیغامِ حقیقت"

نسب ووطن کا اسلامی تخیل بزبانِ اقبال

(جناب شیخ عطاء اللہ صاحب ادارۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

وطن کی خاک کا ذرّہ ذرّہ مقدس ومحبوب ہے جس زمین سے انسان کا مایۂ خمیر اٹھے جس سرزمین سنہرا بچپن اور رسیلی جوانی بسر ہو جس ملک کی زمین انسانی مشتِ خاک کی سرمایہ دار ہو اس کی دلکشی ومحبوبی میں کون شک لانے والا ہے اور شک لانے والے کے لئے حضور خواجہ دوجہان کا ارشاد حب الوطن من الایمان ایک برہان قاطع اور ایک فیصلہ ناطق ہے پس ایک بندۂ مومن کے لئے وطن ایک مقام عزیز ہے (علامہ اقبال کی شاعری اسلامی شاعری ہے اُن کا تخیل اُن کا دل اُن کی زبان متاع اسلام ہیں اور حقیقت میں اُن کے کلام کا جزو غالب ایک منظوم تعلیم اسلام ہے۔

نیا شوالہ اور میرا وطن نہایت تابدار نظمیں ہیں ان کے علاوہ علامہ اقبال کی ابتدائی شاعری میں جابجا احساسات ومحبت وطنی کا اظہار ہوتا ہے اور وطن کی بے حسی اور غلامی کا ماتم تو اس عمر میں بھی قائم ہے۔

تھمے کیا دیدۂ گریاں وطن کی نوحہ خوانی میں — عبادت چشم شاعر کی ہے ہردم باوضو رہنا

دکھا دوں گا میں اے ہندوستاں رنگِ وفا سب کو — کہ اپنی زندگانی تجھ پہ قرباں کر کے چھوڑوں گا

ہندوستان کی نااتفاقی اور اُس کے لازمی نتیجہ کو دیکھ کر فرماتے ہیں

نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو — تمھاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

رُلاتا ہے ترا نظارہ اے ہندوستاں مجھ کو — کہ عبرت خیز ہے تیرا فسانہ سب فسانوں میں

ہندوستان میں غلامی اور بے آبروئی کی زندگی اُن کو دوبھر ہے اور اس کا ماتم آج تک جاری ہے۔

چمن میں آہ کیا رہنا جو ہو بے آبرو رہنا　　بنائیں کیا سمجھ کر شاخِ گل پر آشیاں اپنا

پیامِ مشرق کے انتساب منظوم میں گوئٹے اور اقبال کے وطن کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

من دمیدم از زمینِ مردۂ　　او چمن زادۂ چمن پروردۂ

شکر و شکایت کے عنوان سے اللہ تعالیٰ کے انعام و افضال کے شکریہ کے بعد یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ

ع رکھتا ہوں نہاں خانۂ لاہوت سے پیوند

شکایت ہے تو اس امر کی

جس دیس کے بندے ہیں غلامی پہ رضامند　　لیکن مجھے پیدا کیا اس دیس میں تو نے

اسلام ایک بے پناہ قلبی و ذہنی قوت ہے اور تاریخ عالم کا سب سے بڑا انقلاب اُسی ہی کے تخیلات کا مرہون پس ناممکن ہے کہ مسلمان کی نظر ایک تودۂ خاک میں اُلجھ کر رہ جائے۔ علامہ اقبال کی عمر کے ساتھ اُن کی بالغ نظری بڑھتی گئی اور اسلامی رنگ غالب آتا گیا۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے مغرب کی اس فسوں کاری کو سمجھ لیا اور انسانیت کے لئے وطن کی بت کی پرستش کو بجا طور پر زہر قاتل قرار دیا اور مسلمان کو یاد دلایا کہ خدا کی ساری خدائی اُس کا وطن اور اُس کی برادری ہے۔ اسلام نے تمام بتوں کو توڑ کر اُس کے قدموں پر ڈال دیا لیکن ع

کہ بیزار از خدایانِ کہن ہست　　دمادم نو خداوندے تراشد

انسان نے رنگ و ملک و نسب کے ٹوٹے بتوں کے ٹکڑوں ہی کو پھر جوڑ لیا ہے اور انہی بتوں کا توڑنا مسلمان کے فرائض سے ہے۔

ارشاد ہوتا ہے

ہر زماں در جستجوئے پیکرے　　فکرِ انساں بت پرستے بت گرے

تازہ تر پروردگارے ساختست　　باز طرحِ آذری انداختست

کاید از خوں ریختن اندر طرب | نام او رنگ است وہم ملک ونسب
آدمیت کشتہ شد چوں گوسفند | پیش پائے ایں بتے ناارجمند

وطن کے تخیّل نے بنی نوع انسان کی ہلاکت وتباہی کی صورت اختیار کرلی ہے اُس کا ماتم قابلِ دید ہے

آں چناں قطع اخوت کردہ اند | بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند | نوعِ انساں را قبایل ساختند
مردمی اندر جہاں افسانہ شد | آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت وہفت اندام ماند | آدمیت گم شد واقوام ماند،

مسلمانوں کو یہ تعلیم عہد حاضر میں ملک اور بیرونِ ملک سے ملتی رہی ہے دونوں قسم کے معلموں کا مقصد مسلمان کی نگاہ کو عالمِ اسلام سے کاٹ کر ایک شورزار میں الجھا دینا تھا۔ ہندوستان کی قومیت جدیدہ کی تعمیر میں سب سے پُرجوش نعرہ "ہم ہندوستانی پہلے ہیں ہندو یا مسلمان بعد میں" قرار پایا اور کوشش یہ کی گئی کہ مسلمان کے دل سے خدا کی خدائی کو اپنا سمجھنے کا نور بجھ جائے۔ اقبال نے اس فلسفہ اور سیاست کا ردِعمل بہم پہنچایا اور مسلمان کو حقیقت حال سے آگاہ کیا اور مختلف اوقات میں فرمایا۔

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام، | ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

اس دور میں مے اور ہے جام اور ہے جم اور | ساقی نے بنا کی روشِ لطف وکرم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور | تہذیب کے آذر نے ترشوائے صنم اور

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

یہ بت کہ تراشیدۂ تہذیب نوی ہے | غارت گر کاشانہ دینِ نبوی ہے

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے — اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے — اے مصطفوی خاک میں اس بت کو ملا دے

پیر رومی کا فیصلہ:-

اقبال نے زمانہ حاضر کے بعض مسائل مہمہ کو جناب مولانا رومی اور بقول اُن کے مرشد رومی کے حضور میں بحیثیت مرید ہندی پیش کر کے اُن سے فیصلہ چاہا ہے۔

مرید ہندی دریافت کرتا ہے

تا کجا آویزشِ دین و وطن، — جوہر جاں پر مقدم ہے بدن!

پیر رومی کا فیصلہ ہے

قلب پہلو می زند باز ربِ شب — انتظار روز می دارد ذہب

ارشاد ہوتا ہے

نسرو مغرب آں سراپا مکر و فن — اہل دیں را داد تعلیم وطن
او بفکر مرکز و تو در نفاق — بگذر از شام و فلسطین و عراق
تو اگر داری تمیزِ خوب و زشت — دل نہ بندی با کلوخ و سنگ و خشت
چیست دیں برخاستن از روئے خاک — تا زخود آگاہ گردد جانِ پاک
می نگنجد آں کہ گفت اللہ ہو — در حد و دِ ایں نظامِ چار سو

انسان صرف ایک مشتِ خاک ہی نہیں جان پاک بھی رکھتا ہے اور جان پاک کی ضروریات جسم پر مقدم ہیں کیونکہ جان ہی سرمایۂ شرافت اور پیرایۂ سعادت ہے۔

ہر کہ از خاک و برخیزد ز خاک — حیف اگر در خاک میرد جان پاک
گرچہ آدم بر دمید ان ز آب و گل — رنگ و نم چوں گل کشید از آب و گل
حیف اگر در آب و گل غلطد مدام — حیف اگر برتر نہ پرد زیں مقام

گفت تن در شو بخاکِ رہگذر — گفت جاں پہنائے عالم را نگر
جاں نگنجد در جہات اے ہوشمند — مردِ حُر بیگانہ از ہر قید و بند
حُر ز خاکِ تیرہ آید در خروش
زانکہ از بازاں نیاید کارِ موش

انسانی فطرت عالمگیر ہے مشرق و مغرب کی گتھیاں ہمارے اوہام باطلہ کی پیدائش ہیں

آں کفِ خاکے کہ نامیدی وطن — ایں کہ گوئی مصر و ایران و یمن
با وطن اہلِ وطن را نسبتے است — زانکہ از خاکش طلوعِ ملتے است
اندریں نسبت اگر داری نظر — نکتہ بینی ز مو باریک تر
گرچہ از مشرق بر آید آفتاب — با تجلی ہائے شوخ و بے حجاب
در تب و تاب است از سوزِ دروں — تا ز قیدِ شرق و غرب آید بروں
بر دمد از مشرقِ خود جلوہ مست — تا ہمہ آفاق را آرد بدست
فطرتش از مشرق و مغرب بری است
گرچہ او از روئے نسبت خاوری است

مسلم استی دل باقلیمے مبند — گم مشو اندر جہانِ چون و چند
می نگنجد مسلم اندر مرز و بوم — در دلِ او یاوہ گردد شام و روم
دل بدست آور کہ در پہنائے دل
می شود گم ایں سرائے آب و گل

ہجرت نبوی اور مفہوم وطن کا تعلق یوں واضح فرمایا ہے۔

عقدۂ قومیت مسلم کشود — از وطن آقائے ما ہجرت نمود
حکمتش یک ملتِ گیتی نورد — بر اساسِ کلمۂ تعمیر کرد

تا ز بخششہائے آں سلطان دیں | مسجد ما شد ہمہ روئے زمیں
آں کہ در قرآں خدا او را ستود | آں کہ حفظِ جانِ او موعود بود
دشمناں بے دست و پا از ہیبتش | لرزہ بر تن از شکوہ فطرتش
پس چرا از مسکنِ آبا گریخت | تو گماں داری کہ از اعدائے گریخت
قصہ گویاں حق ز ما پوشیدہ اند | معنیِ ہجرت غلط فہمیدہ اند
ہجرت آئینِ حیاتِ مسلم است | ایں ز اسبابِ ثباتِ مسلم است
معنی او از تنک آبی رم است | ترکِ شبنم بہر تسخیرِ یم است
صورت ماہی بہ بحر آباد شو | یعنی از قیدِ مقام آزاد شو
ہر کہ از قیدِ جہات آزاد شد | چوں فلک در شش جہت آباد شد

اردو میں اس خیال کو مدتوں پہلے زیادہ وضاحت سے بیان فرمایا تھا۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی | رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی
ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی | دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی
گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے | ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے
اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے | تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے | کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے
اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے تو اس سے | قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے تو اس سے

ملت اسلامیہ کی وحدت پر ارشاد ہوتا ہے

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم | چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیزِ رنگ و بو بر ما حرام است | کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

ہنوز از بند آب و گل نہ رستی، تو گوئی رومی و افغانیم من
من اوّل آدم بے رنگ و بوئم ازاں پس ہندی و تورانیم من

ماکہ از قیدِ وطن بیگانہ ایم، چوں نگہ نورِ دو چشمیم و یکیم
از حجاز و چین و ایرانیم ما، شبنم یک صبحِ خندانیم ما،
مستِ چشمِ ساقیِ بطحاستیم در جہانِ مثلِ مے و میناستیم
چوں گل صد برگ ما را بو یکیست اوست جانِ ایں نظام و او یکیست

اے کہ یکجا در چمن انداختی مثلِ بلبل با گلے در ساختی
چوں صبا بارِ قبول از دوش گیر گلشن اندر حلقۂ آغوش گیر

از فریبِ عصرِ نو ہشیار باش
رہ فتد اے رہرو ہشیار باش

نسب کے غرور باطل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ اسلام مسلمان کا سب سے بڑا شرف ہے مسلمانوں میں یہی سب سے بڑا رشتہ اور نسب ہے

بر نسب نازاں شدن نادانی است حکم او اندر تن و تن فانی است
ملّت ما را اساس دیگر است ایں اساس اندر دلِ ما مضمر است
حاضریم و دل بغایب بستہ ایم پس ز بندِ ایں و آں وارستہ ایم
رشتۂ ایں قوم مثلِ انجم است چوں نگہ ہم از نگاہِ ما گم است
تیرِ خوش پیکانِ یک کیشیم ما یک نما یک بیں یک اندیشیم ما
مدعائے ما مآلِ ما یکیست، طرز و انداز خیالِ ما یکیست
ما ز نعمہائے او اخواں شدیم یک زبان و یک دل و یکجاں شدیم

جن لوگوں نے اسلام قبول کر لینے کے بعد غرور کو رکھا ہے اُنھوں نے اسلامی تعلیم کی حقیقت سے حصہ نہیں پایا۔

خویشتن را تُرک و افغاں خواندہ، وائے بر تو آنچہ بودی ماندہ
فارغ از ارباب دام و اعمام باش ہمچو سلمان زادۂ اسلام باش
گر نسب را جزو ملت کردہ رخنہ در کارِ اخوت کردہ
عشق در جان و نسب در پیکر است رشتۂ عشق از نسب محکم تر است
تو اے کودک منش خود را ادب کن مسلماں زادہ ترک نسب کن
برنگِ احمر و خون و رگ و پوست عرب نازد اگر ترکِ عرب کن
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

وحدتِ ملت حیاتِ ملت کے لئے ضروری ہے

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے نیل کے ساحل سے لے کر تابخاک کاشغر
جو کریگا امتیاز رنگ و خوں مٹ جائیگا ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگذر
یہ ہندی یہ خراسانی یہ افغانی و تورانی تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہو جا
غبار آلودہ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے تو اے مرغِ حرم اُڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

ڈاکٹر اقبال قومی مصلح کی حیثیت میں

(مس تاج بیگم صاحبہ لکچرار فارسی
مسلم گرلس کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

ڈاکٹر اقبال بحیثیت قومی شاعر ہونیکے نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام عالم اسلام کے لئے مایۂ فخر و ناز ہیں۔ وہ شاعر کے لباس میں قومی ریفامر ہیں۔ اُن کی شاعری نام ہے اُن احساساتِ درد ملّت کا۔ اُن جذباتِ غم قوم کا۔ اُس سوز و گداز کا جو کبھی نالہائے بلبل کی طرح فضائے عالم میں منتشر ہو کر اسلام کے خزاں دیدہ گلستان کی بہار رفتہ پر نوحہ خوانی کرتے نظر آتے ہیں تو کبھی گداز شمع کی مانند بزم اسلام کی بے رونقی پر اشک فشانی۔ لیکن باایں ہمہ اُن کی شاعری صرف قوم کی گذشتہ شان و شوکت کا مرثیہ اور موجودہ زبوں حالی کا نوحہ لکھنے تک ہی محدود نہیں۔ بلکہ بحیثیت قومی مصلح کے وہ ان متضاد حقیقتوں کے علل و اسباب پر بحث کر کے بتاتے ہیں کہ ماضی میں عروج اسلام کا باعث کیا تھا اور موجودہ نگونساری کی وجہ کیا ہے۔

قوم کے شاندار ماضی کے تذکرے ابھی زبان عالم سے فراموش نہیں ہوئے تھے لیکن حال کی پستی و ادبار کی بھیانک تصویر بھی سامنے تھی۔ ہمارا ذکی الحس شاعر درد قومی سے تلملا اٹھا یہی غم ملّت کے جذبات اُس کی قومی شاعری کا سرچشمہ ہیں۔ اُن کا وسیع مطالعۂ اسلامیات اُن کے دل میں ان جذبات کی تحریک کا باعث ہوا۔ اسلام کی سیزدہ صد سالہ تاریخ کا ہر ورق مسلمانوں کی گذشتہ شوکت کی داستانیں سنایا کرتا ہے اقبال نے بھی ان داستانوں کو سنا لیکن عام سامعین کی طرح سن کر فراموش نہ کر دیا۔ اور فراموش کیونکر کرتا جبکہ ایک طرف خود حساس دوسری طرف داستانیں ولولہ خیز اور پھر لطف یہ کہ داستانیں افسانہ نہ تھیں۔ حقیقت تھیں۔ صداقت پر مبنی تھیں۔ ایشیا یورپ اور افریقہ کے صدہا تاریخی مقامات سر بفلک عمارات اور خوبصورت مساجد کی صورت میں ان داستانوں کی صداقت پر گواہ تھے۔ گواہ ہیں اور گواہ رہیں گے۔

ان چیزوں نے اس حساس مسلمان کے دل میں ملی جذبات کا سیلِ بے پناہ پیدا کر دیا یہی جذبات قیام یورپ کے اختتام پر اُس کے خیالات میں انقلاب عظیم پیدا کرنے کا باعث بنے۔ سفر یورپ سے پیشتر وہ ایک شاعر تھے۔ قادر الکلام۔ فصیح البیان۔ رفیع التخیّل۔ شیریں سخن۔ سب کچھ تھے۔ لیکن صرف شاعر۔

اُس وقت تک اُن کے رخشِ خیال کی جولانیاں حسن وعشق یا اِس سے کچھ آگے وطنیت کے تنگ میدان میں محدود تھیں۔ لیکن سفرِ یورپ اور قیامِ یورپ کا زمانہ اُن کی شاعری کے ارتقا کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اِس زمانہ میں انھوں نے دنیا بھر کے نئے اور پرانے فلاسفروں کے خیالات کا مطالعہ کیا۔ اِس وسیع مطالعہ اور تحقیق نے نہ صرف یہ کہ اُن کی عام واقفیت اور قابلیت میں ہی اضافہ کیا بلکہ انھیں خود بھی مفکر و مجتہد فلسفی بنا دیا۔ اِسی زمانہ میں اُنھوں نے فلسفہ و علوم اسلامیہ کا بھی مطالعہ کیا اور اِس طرح تفکر و اجتہاد کے آغاز کے ساتھ ہی اُن میں احساسِ قومی بھی پیدا ہو گیا۔ ان چیزوں نے اُن کی تخیل کو عام شاعری کی تنگنائے سے نکال کر غمِ ملّت کی وسعتِ غیر محدود میں داخل کر دیا۔

اِس زمانہ کی سب سے بڑی خصوصیت اقبال کی پیغمبرانہ شان کا آغاز ہے۔ ایک طرف اسلام کی شاندار روایات۔ دوسری طرف ذلت و خواری۔ ایک طرف آدمی دنیا پر حکومت دوسری طرف غلامی۔ وہ دینی و دنیاوی دولت کی افراط اور یہ بے دینی لا مذہبی کے ساتھ افلاس و ناداری اتنی متضاد حقیقتیں تھیں جن کی تہ تک پہنچنے کیلئے اِس قومی مصلح کا فلسفیانہ دماغ پوری قوت کے ساتھ مصروفِ کار تھا۔ مسلمانوں کا گذشتہ عروج کن محاسن کا مرہونِ منت تھا اور موجودہ نکبت کن مصائب کی پاداش میں ہے؟ یہ دو سوالات تھے جو اُسکے تمام تر تفکر و اجتہاد کا مرکز تھے۔ سوز دردِ ملت تو ایک عرصہ سے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ بلکہ بڑھتے بڑھتے وہ داغ بن چکا تھا جس کے متعلق خود فرماتے ہیں۔

گرم رکھتا تھا ہمیں سردیِ مغرب میں جو داغ ‏ ‏ ‏ ‏ چیر کر سینہ اسے وقفِ تماشا کر دیں

لیکن یہ سوز یہ تڑپ جس نے اِن کے خیالات کی رو کو پلٹ دیا۔ اُن کی شاعری کی صورت ہی بدل دی اِس کے فوری محرکات کیا تھے؟ سفرِ یورپ کے دوران میں اُنھوں نے وہ مقامات دیکھے جو صدیوں تک حجازی تہذیب کا مرکز رہ چکے تھے۔ جنھیں نشۂ اسلام سے مخمور رہبا اور غازیوں نے اپنے ایمان کی برکت اور قوتِ بازو سے تسخیر کیا تھا۔ جہاں علمِ اسلام صدیوں تک لہرا لہرا کر خدائے واحد کی عظمت و جلال کا اظہار کرتا رہا۔ کفرستانِ یورپ میں یہ مقامات صدیوں تک نورِ اسلام کی ضیا پاشی کرتے رہے لیکن

اب ۔۔۔ اب ان مقامات پر وہی کفر کی تاریکی تھی۔ ضلالت کی ظلمت تھی تثلیث کی حکومت تھی۔ تکبیر کی صدا خاموش ہو چکی تھی۔ اقبال تہذیب اسلام کے اِس گورستان کو دیکھکر ہجوم غم سے بے قرار ہوگیا آپ کی نظم "صقلیہ جزیرہ سسلی" میں ہی نہیں بلکہ مغرب بھر میں تہذیب حجازی کی موت کا مرثیہ سمجھنا چاہیئے۔ اس نظم میں ایک مقام پر فرمایا ہے۔

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر — داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی — ابن بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی
غم نصیب اقبالؔ کو بخشا گیا ماتم ترا — چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

اسی نظم میں فرمایا ہے

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے — قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا — خود یہاں روتا ہوں اوروں کو وہاں رلواؤں گا

"بلاد اسلامیہ" میں بھی مسلمانوں کی کئی مٹی ہوئی بستیوں کو یاد کر کے آنسو بہائے ہیں ڈاکٹر اقبال کے جذبات ملت میں اشتعال پیدا کرنے کا دوسرا بڑا باعث اُس زمانہ کے مسلمانوں کی زبوں حالی تھی مسلمان ہندوستان کے اندر اور باہر ہر جگہ اور ہر ملک میں ذلیل ہو رہے تھے۔ جنگ بلقان اور طرابلس الغرب کی لڑائیوں میں خون مسلم پانی کی طرح بہایا جا رہا تھا۔ قسطنطنیہ میں خلافت کا مریض آخری سانس لے رہا تھا۔ الغرض اسلام کا سیاسی اقتدار مٹنے والا تھا۔ اس لئے ہمارے قومی شاعر کا دل غم و الم کی آماجگاہ تھا۔

انہی جذبات غم نے اِس مجتہد شاعر کے فکر کو جلا دی اور اُس نے اسلام کے ماضی کے تذکروں اور حال کی تصویروں میں اپنے دونوں سوالات کا جواب پالیا۔ نوائے سروش نے اس قومی پیغامبر کو سنادیا کہ اسلام اور مسلمانوں کی گذشتہ عظمت اس وجہ سے تھی کہ ان میں اخوت تھی مساوات تھی خلوص تھا جذبہ ایثار تھا۔ خود داری تھی اور سب سے بڑھکر یہ کہ انھیں خداتعالےٰ پر ایمان کامل تھا۔ وہ تعلیم اسلام کے حامل بھی تھے اور عامل بھی۔ یہ اوصاف تھے جن کی بدولت وہ ان اشعار کا مصداق بنے۔

تھے ہمیں ایک ترے معرکہ آراؤں میں　　خشکیوں میں کبھی لڑتے کبھی دریاؤں میں
دی اذانیں کبھی یورپ کے کلیساؤں میں　　کبھی افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں میں
شان آنکھوں میں نہ جچتی تھی جہانداروں کی　　کلمہ پڑھتے تھے ہم چھاؤں میں تلواروں کی

اور پھر:-

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے　　بحر ظلمات میں دوڑا دیئے گھوڑے ہم نے

موجودہ زمانہ کے مسلمان اپنے اسلاف کے اوصاف سے عاری ہیں تعلیم اسلام سے بیگانہ ... ہیں۔ اخوت و مساوات ذاتوں اور فرقوں میں تقسیم ہوگئی ہے اِن کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود　　یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود
یوں تو سید بھی ہو مرزا بھی ہو افغان بھی ہو　　تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

اِن میں اتحاد کا کہیں دور دور بھی پتہ نہیں ملتا۔ عفو و خطا پوشی کا کہیں نام نہیں۔ اِس مضمون کے ضمن میں موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کا ان کے اسلاف کے ساتھ مقابلہ کیا ہے فرماتے ہیں

تم ہو آپس میں غضبناک وہ آپس میں رحیم　　تم خطا کار و خطا بیں وہ خطا پوش و کریم
خودکشی شیوہ تمہارا وہ غیور و خود دار　　تم اخوت سے گریزاں وہ اخوت پہ نثار

اس مضمون کو کہ ابتدائی زمانہ کے مسلمان دنیا میں اس وجہ سے معزز و مکرم تھے کہ وہ صحیح معنوں میں مسلمان تھے اور موجودہ مسلمان اِسلئے ذلیل ہیں کہ وہ تعلیم قرآن کو فراموش کر چکے ہیں۔ یوں بیان فرماتے ہیں۔

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہوکر　　اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

وہ افسوس کرتے ہیں کہ مسلمان قوم اپنا وقار کھو دینے کے بعد احساسِ زیاں تک نہیں کرسکتی،

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

الغرض اقبال قومی پستی کے اسباب و وجوہ سے آگاہ ہوکر قوم کی اصلاح کا بیڑا اُٹھاتے ہیں چنانچہ اِس کے بعد کے کلام کا اکثر و بیشتر حصہ اسی مشن "اصلاح قوم" سے متعلق ہے۔ شکوہ جواب شکوہ

خضرِراہ ۔ طلوعِ اسلام ۔ ترانۂ ملّی ۔ خطاب بہ نوجوانانِ اسلام مسلم وغیرہ ان کی معرکۃ الآرا قومی نظمیں ہیں ان کا ہر ہر شعر دردِ قومی میں ڈوبا ہوا ہے ۔ ہر لفظ میں صورِ اسرافیل کی سی گونج ہے جو غفلت کے مارے مسلمانوں کے مردہ جذبات کو پیغامِ حیات دیتی ہے ۔)

اُن کا تخیّل پیغامِ سروش ہے ۔ اندازِ بیان اعجاز ہے جو اِن کے کلام کو پڑھنے یا سننے والوں کے دلوں میں اُتر کر انھیں منقلب کر دیتا ہے ۔

"خطاب بہ جوانانِ اسلام" میں فرماتے ہیں ۔

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے ۔۔۔ وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا

تجھے اِس قوم نے پالا ہے آغوشِ محبت میں ۔۔۔ کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں میں تاجِ سرِ دارا

بہت سی خوبیاں کرنے کے بعد فرماتے ہیں

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرانشیں کیا تھے ۔۔۔ جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا

کون جوان مسلم ہے جو اس نظم کو پڑھے اور اس کے دل میں اپنے اسلاف کی سی جہاں گیری جہانداری جہانبانی اور جہاں آرائی کی خواہش پیدا نہ ہو ۔

(الغرض اقبال اپنی قوم کے مردہ جذبات کو زندہ کرنے کے لئے انھیں درس دیتے ہیں ۔ اُمید کا خودی کا ۔ ملّت پرستی کا ۔ تعلیمِ اسلام پر عمل کرنے کا ۔ ایثار کا ۔ اتحاد کا ۔ کیونکہ انہی اوصاف کی بدولت اُن کے اسلاف فاتحِ عالم بنے تھے اور انہی سے عاری ہو کر موجودہ مسلمان رسوائے عالم ہیں ۔ وہ پُر اُمید شاعر ہیں اپنی قوم کو پیغام دیتے ہیں کہ اے مسلمانو تمھاری موجودہ پست حالی تمھیں مایوس نہ کر دے مسلمانوں کو یاس سے کچھ مناسبت نہیں ۔ وہاں تو لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَۃِ اللّٰہِ تعالیٰ کا فرمان ہے ۔ تم لاعلاج نہیں ہو ۔ اُٹھو ہمت کرو اور اس ادبار کی ذلّت کو مٹا دو ۔ اگر تعلیمِ اسلام کے بھولے ہوئے سبق کو پھر سے یاد کر لو تو اب بھی دنیا میں سرفراز ہو سکتے ہو ۔)

بخواں از بر صداقت را ۔ عدالت را شجاعت را ۔۔۔ کہ عالم باز میگیرد ز تو کارِ امامت را

تم اب بھی وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ۔ کے وعدہ کے مطابق دنیا کے حکمران ہو سکتے ہیں۔ ولا تھنوا ولا تحزنوا انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ کے ارشاد کے بموجب اب بھی سرفراز ہو سکتے ہو مگر شرط یہ ہے کہ سچے مسلمان بنو

اور بہت سی خامیوں کے علاوہ جس چیز نے مسلمانوں کے جذبۂ عمل کو مردہ کر کے ان پر سکوت و جمود کی حالت طاری کی ہے۔ وہ ہمارے صوفی حضرات کا مسئلہ جہاد بالنفس ہے جس میں وہ خودی کو مٹانے کی تلقین کرتے ہیں۔ وہ دنیا کی بے ثباتی پر ضرورت سے زیادہ زور دیکر دنیاوی اعزاز و اکرام کو نگاہوں میں ہیچ کر دیتے ہیں۔ پھر جب کسی چیز کی وقعت ہی دل میں نہ رہی تو اُسے حاصل کرنے کی تمنا پیدا ہو تو کیونکر۔ اور جب تمنا ہی نہ ہو۔ خواہشات ہی مردہ ہو جائیں تو جد وجہد کی جائے تو کس چیز کے لئے؟ حضرت اقبال نے اس حقیقت کو معلوم کر لیا کہ جہاد بالنفس کی تلقین نے قوم کے ذہنی۔ جسمانی اور روحانی قوا کو ناتواں کیا ہے۔ بے جا عجز و خاکساری نے خودی و خودداری کو فنا کیا ہے۔ اور توکل و قناعت کی صوفیانہ تاویلوں نے تگ و دو کے میدان کو بالکل ہی مسدود کر دیا ہے۔ الغرض اِس صوفیانہ تعلیم نے مسلمان قوم کے جذبۂ عمل کو پامال کرنے کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا کیا۔ اسلام کی تعلیم تو فکر و عمل جد وجہد۔ اخلاقی قوت۔ جوش و سرگرمی ہے اور ہماری قوم بحیثیت قوم اِن اوصاف سے عاری ہو چکی تھی۔ اس کی وجہ خواہ صوفیانہ تعلیم تھی یا مسلمانوں کی اپنی عافیت کوشی و عیش پرستی۔ بہر حال ہمارے مصلح شاعر نے محسوس کیا کہ احیائے ملّت کے لئے جذبۂ عمل کا احیا ضروری ہے اور وہ اس وقت تک پیدا نہ ہو گا جب تک قوم اپنی حقیقت کو پہچان کر احساسِ زیاں نہ کرے گی۔ لہذا آنھوں نے قوم کو پیغام خودی دیا تاکہ وہ اپنی حقیقت کو سمجھیں۔ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ مسلمان کا مقام پستی نہیں وہ تو عرش بریں سے بھی بلند رتبہ ہے بمسلمان کس قدر رفیع القدر ہے وہ اِن الفاظ میں بتاتے ہیں۔

پرے ہے چرخ نیلی فام سے منزل مسلماں کی	ستارے جسکی گرد راہ ہوں وہ کارواں تو ہے
مکاں فانی مکیں آنی ازل تیرا ابد تیرا	خدا کا آخری پیغام ہے تو جاوداں تو ہے

جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر　　　نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تو ہے
یہ نکتہ سرگذشتِ ملّتِ بیضا سے ہے پیدا　　　کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تو ہے

اپنی حقیقت اپنی قدر و منزلت پہچاننے کے بعد ضروری ہے کہ قوم کو اُس کی پست حالی کا احساس ہو۔ چنانچہ اِس فطرت شناس مصلح نے محسوس کیا کہ مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار ہو کر رہے ہیں۔ اُن میں صدیوں کے مردہ جذبات ملی حیاتِ تازہ پا رہے ہیں۔ تو ضروری ہوا کہ اِن جذبات کو بر سرِ کار لانے کے لئے قوم کے دل میں شوکتِ رفتہ کو حاصل کرنے کی آرزو پیدا کی جائے۔ چنانچہ اقبال نے مسئلہ آرزو پر بحث کرتے ہوئے مختلف طریقوں سے اس کی اہمیت کو واضح کیا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

زندگی در جستجو پوشیدہ است　　　اصل او در آرزو پوشیدہ است
آرزو را در دل خود زندہ دار　　　تا نگردد مشتِ خاکِ تو مزار
آرزو جانِ جہانِ رنگ و بوست　　　فطرتِ ہر شے امینِ آرزوست
از تمنا رقصِ دل در سینہ ہا　　　سینہ ہا از تابِ او آئینہ ہا
طاقتِ پرواز بخشد خاک را　　　خضر باشد موسئ ادراک را
دل ز سوزِ آرزو گیرد حیات　　　غیرِ حق میرد چو او گیرد حیات

الغرض درسِ خودی میں اقبال نے پیغامِ حیات دیا۔ تلقین صوفیا کے مطابق تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا ناپائدار ہے اس سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ لیکن اقبال فرماتے ہیں مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا کے ارشاد کے ماتحت دنیا اور حیاتِ دنیا بے حقیقت اور فضول نہیں بلکہ تخلیقِ ہستی کے مقاصد نہایت ہی بلند واقع ہوئے ہیں۔

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار　　　اور اِس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار

وہ فرماتے ہیں کہ اگر دنیا فانی ہے تو ہوا کرے انسان کو اپنی جد و جہد سے سعی و عمل سے اس فنا کو بقا میں تبدیل کرنا چاہئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

پھونک ڈالے یہ زمین و آسمانِ مستعار　　اور خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرے
زندگی کی قوتِ پنہاں کو کر دے آشکار　　تا یہ چنگاری فروغِ جاوداں پیدا کرے

الغرض اقبال نے قوم کو فلسفۂ خودی میں یہ سبق سکھایا کہ وہ اپنی حقیقت کو پہچانیں اپنے روحانی وجسمانی ارتقا کے لئے تمام فطری قوتوں کو سرگرم عمل رکھیں۔ مقصد حیات کے حصول کی جدوجہد کو کبھی بند نہ کریں۔

اقبال اسی ضمن میں قوم کو خودداری کا سبق سکھاتے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان اپنی حقیقت کو پہچان کر ایسی روحانی ونفسیاتی قوت پیدا کریں جو اُنھیں بغیر کسی دوسرے کی اعانت کے عروج و کمال تک پہنچا دے۔ کیونکہ مسلمان کی غیرت اس بات کی متقاضی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کی ضرورت سے بے نیاز ہو۔ مسلم فطرتاً حُر ہے اُسے کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہونا چاہئے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

تا توانی کیمیا شو گل مشو　　در جہاں منعم شو سائل مشو

پھر فرمایا ہے۔

کرمک ناداں طوافِ شمع سے آزاد ہو　　اپنی فطرت کے تجلی زار میں آباد ہو

ایک جگہ تلقین فرمائی ہے۔

مور بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر　　مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست

پیامِ اُمید اور درسِ خودی کے بعد وہ جس چیز کو احیائے ملت کے لئے ضروری سمجھتے ہیں وہ اجتماعیت ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو جو چیز قدم قدم پر فتح ونصرت دیتی تھی۔ وہ اُنکی اور بہت سی خوبیوں کے علاوہ جمعیت قومی تھی۔ اُنھوں نے اپنی انفرادیت کو قومیت میں جذب کر دیا تھا۔ ہر مسلمان کا نصب العین ایک اور مقصود واحد ہوتا تھا۔ چنانچہ اُن کی متحدہ طاقت کا سمندر جوش وخروش کی ہنگامہ خیزی کے وقت اپنے سامنے کی ہر بڑی سے بڑی چیز کو بہالے جاتا اور خود کردہ عالم کی سمتوں میں جس طرف چاہتا راہ بناتا ہوا چلا جاتا۔ لیکن آج کے مسلمانوں میں قوت کا فقدان اِس وجہ سے

ہے کہ ان کی طاقت جغرافیائی حدود، رنگ و نسل کے امتیازات اور عقیدہ کے فروعی اختلافات پر منقسم ہے۔ اقبال ان چیزوں کو مٹا کر پھر سے جماعتی زندگی پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے — نیل کے ساحل سے لیکر تابخاکِ کاشغر
جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائیگا — ترک خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہوگئی — اُڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہگزار

پھر ایک جگہ فرماتے ہیں۔

بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہوجا — نہ تورانی رہے باقی نہ ایرانی نہ افغانی

ڈاکٹر اقبال کی اس تعلیم کو بعض اصحاب پین اسلامزم کے نام سے پکارتے ہیں۔ لیکن یہ پین اسلامزم عین اسلام ہے۔ اخوت۔ مساوات۔ جماعتی زندگی یہ سیاسی و معاشرتی اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ ہماری روایات ماضی اس پر شاہد عادل ہیں۔ اقبال کا فلسفہ اجتماع کوئی نئی اور الگ چیز نہیں بلکہ فلسفۂ اسلام کی ایک شق ہے وہ اس میں مسلمانوں کو واعتصموا بحبل اللہ جمیعا کا بھولا ہوا سبق یاد دلاتے ہیں۔ آج مسلمانوں کی کتنی قسمیں ہیں۔ عربی، ایرانی۔ مصری۔ ہندی وغیرہ وغیرہ اور پھر سید، افغان، مرزا صاحبان اور اس کے بعد شیعہ سنی وہابی احمدی وغیرہ وغیرہ اصحاب۔ الغرض مسلمانوں کو اس تقسیم در تقسیم نے بے حد کمزور کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے ایک مصلح کی حیثیت سے محسوس کیا کہ اس قومی ناتوانی کا علاج اس وقت تک ممکن نہیں جب تک ان ٹکڑوں کو یکجا کر کے جوڑا نہ جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی — تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بیکراں ہوجا

پھر فرمایا ہے اور بجا فرمایا ہے۔

فرد قائم ربط ملت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں

پھر فرماتے ہیں۔

آبرو باقی تری ملّت کی جمعیت سے تھی　　　　جب یہ جمعیت گئی دنیا میں رسوا تو ہوا

ان چیزوں نے علاوہ مسلمانوں کی کمزوری کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اُن کا ایمانِ مسلمانانِ سلف کا سا پختہ نہیں۔ ہمارے اسلاف ماسوا اللہ کو ہیچ سمجھتے تھے۔ اُن میں ایمان کی طاقت تھی۔ وہ سوائے خدا کے کسی سے ڈرتے نہ تھے۔ لیکن آج کے مسلمانوں کو قدم قدم پہ دنیاوی خداؤں کا خوف ہے۔ ایمان کی اس کمزوری نے اُنھیں بزدل بنا دیا ہے اگر اپنے اسلاف کی طرح ان کو خدا تعالیٰ پر پختہ یقین و ایمان ہو جائے تو دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت ان کے عزائم کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ یقین ایک ایسی طاقت ہے جو اُن کے قلوب سے ماسوائے اللہ کے خوف کو نکال کر اب بھی اُن کی بگڑی تقدیر کو بنا سکتی ہے۔

یقین افراد کا سرمایۂ تعمیر ملّت ہے　　　　یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملّت ہے

پھر فرمایا ہے۔

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا　　　　تو کر لیتا ہے یہ بال و پر روح الامیں پیدا

ایک جگہ اِس مضمون کو کہ ایمان کی طاقت سے انسان سب کچھ کر سکتا ہے۔ یوں باندھا ہے۔

ولایت، پادشاہی، علم اشیا کی جہانگیری
یہ سب کیا ہیں فقط اک نقطۂ ایماں کی تفسیریں

الغرض اُنھوں نے مسلمان قوم کی تمام بیماریوں کا علاج تعلیم اسلام پر عمل تجویز فرمایا ہے اُن کی تعلیم کا لب لباب یہ ہے کہ مسلمان اپنے اسلاف کے اوصاف کو اپنے میں پیدا کریں اخوت، مساوات جمعیت، عدل، شجاعت، جذبۂ عمل، خدا تعالےٰ پر ایمان کامل یہ چیزیں ہیں جو ان کے شاندار ماضی کو حال میں تبدیل کر سکتی ہیں۔ وہ اہل ہند کو تہذیب مغرب کی خامیوں سے آگاہ کر کے اس سے بچنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور فرماتے ہیں کہ تہذیب اسلام میں نہ صرف مسلمانوں بلکہ دنیا کی تمام اقوام کی سلامتی کا راز مضمر ہے۔

انسانیت کے مدارج عالیہ اور اسکے نمونے ڈاکٹر سر محمد اقبال کی نظر میں

(نجم حسین ضیا لکچرار ٹریننگ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

دورحاضرہ میں انسانیت کی عظمت کے علمبردار ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اسرار خودی کو جتاکر جہاں انسانی زندگی کے وقار کو آشکار کیا ہے وہاں ایسی ہستیوں کو بھی پیش کیا ہے جن کی زندگیاں انسانی "انا" کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ خودی کی استواری کو جہاں زندگی کی قوت اور بلندی کا معیار قرار دیا ہے وہاں ایسی ہستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کے اعمال و کردار نے انسانی خودی کی عظمت کو نمایاں کیا ہے۔ عشق اور محبت کو جہاں خودی کے استحکام کا ذریعہ ٹھہرایا ہے وہاں ایسی ذوات مقدسہ سے بھی ہمیں روشناس کرایا ہے جن کی محبت ہماری خودی کے استحکام کا باعث ہو سکتی ہے اور جن کی تاسی سے انسانی "انا" تربیت پاکر ارتقا کے مدارج عالیہ پر فائز ہو سکتی ہے۔

عاشقی؟ محکم شو از تقلید یار ۔۔۔ تا کمند تو شود یزداں شکار
لشکرے پیدا کن از سلطان عشق ۔۔۔ جلوہ گر شو بر سر فاران عشق،
تا خداے کعبہ بنوازد ترا ۔۔۔ شرح انی جاعل سازد ترا

نوع انسانی کی عظمت کا تخیل اس سے بلند تر اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ جوہر نوری جو ہم میں ہے۔ جسے انا۔ خودی یا "میں" سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ایسی صلاحیت رکھتا ہے کہ وہ مدارج عالیہ طے کر کے نیابت الٰہی کے درجہ پر فائز ہو سکتا ہے اور حقیقی معنوں میں خلیفۃ اللہ کہلانے کا مستحق بن سکتا ہے اب نائب الٰہی کی شان اور عظمت ملاحظہ فرمائیے۔ انسانی مدارج کمال کی بلندی کا اندازہ لگائیے۔

نائب حق ہم چو جان عالم است ۔۔۔ ہستی لفظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگاہ بود ۔۔۔ در جہاں قائم با مراللہ بود
نغمہ زا تار دل از مضراب او ۔۔۔ بہر حق بیداری او خواب او

ازقم او خیزد اندر گور تن — مردہ جانہا چوں صنوبر در چمن

زندگی بخشد ز اعجاز عمل — می کند تجدید انداز عمل

لیکن نیابت الٰہی کے عالی درجہ اور عظیم الشان مرتبہ پر پہنچنے کے لئے کچھ مرحلے ہیں جو طے کرنے ہوتے ہیں ان میں پہلا مرحلہ اطاعت ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

در اطاعت کوش اے غفلت شعار — می شود از جبر پیدا اختیار

ہر کہ تسخیر مہ و پرویں کند — خویش را زنجیری آئیں کند

باطن ہر شے ز آئینے قوی — تو چرا غافل ازیں ساماں روی

عاشقی محکم شو از تقلید یار — تا کمند تو شود یزداں شکار

تا خدائے کعبہ بنوازد ترا — شرح انی جاعل سازد ترا

اس طرح پابندی آئین کو خودی کی تربیت کے لئے ضروری بتایا ہے لیکن وہ کونسا آئین ہے جس کی پابندی ان مدارج عالیہ پر پہنچنے کے لئے لازمی ہے۔ اس کے لئے بھی ڈاکٹر صاحب کا ارشاد سنئے۔

شکوہ سنج سختی آئیں مشو — از حدود مصطفےٰ بیروں مرو

بازاے آزاد دستور قدیم — زینت پاکن ہماں زنجیر سیم

لیکن آئین مصطفوی میں وہ کیا خصوصیت ہے کہ نوع انسانی کے لئے ان ہی آئین کی پابندی باعث شرف و افتخار ہے اس سوال کا جواب بھی ڈاکٹر صاحب کے کلام سے ملیگا اور وہ یہ ہے:۔

بود انساں در جہاں انساں پرست — ناکس و نابود و مند و زیردست

سطوت کسریٰ و قیصر رہزنش — بند ہا در دست و پا و گردنش

کاہن و پاپا و سلطان و امیر — بہر یک نخچیر صد نخچیر گیر

صاحب اورنگ و ہم پیر کنشت — باج بر کشت خراب او نوشت

در کلیسا اسقف رضواں فروش — بہر ایں صید زبوں دامے بدوش

برہمن گل از خیابانش ببرد | خرمنش مغ زادہ با آتش سپرد
از غلامی فطرت او دوں شدہ | نغمہ ہا اندر نے او خوں شدہ
تلامذے حق بحق داراں سپرد | بندگاں را مسند خاقاں سپرد
حریت زاد از ضمیر پاک او | ایں مے نوشیں چکید از تاک او
کل مومن اخوۃ اندر دلش | حریت سرمایہ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ | در نہاد او مساوات آمدہ

آئین مصطفوی کی پابندی اسلئے نوع انسانی کے لئے باعث شرف ہے کہ یہی ایک آئین ہے جو فرد انسانی کے برابری کے حقوق کی ضمانت کرتا ہے۔ عالم گیر برادری قایم کرتا ہے۔ اور ہر فرد کے لئے پوری آزادی کی فضا پیدا کرتا ہے غلامی کی زندگی خودی کی موت کا باعث ہوتی ہے۔ آئین مصطفوی مساوات۔ اخوت اور حریت کی بنیاد ڈالتا ہے اور اسی لئے نبی نوع انسان کے لئے بزرگی اور شرف کی راہیں کھولتا ہے خودی کی تربیت کا دوسرا مرحلہ ضبط نفس ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ہر کہ بر خود نیست فرمانش رواں | می شود فرماں پذیر از دیگراں

اب ضبط نفس کے ذرائع سنئے۔

تا عصائے لا الٰہ داری بدست | ہر طلسم خوف را خواہی شکست
ہر کہ در اقلیم لا آباد شد، | فارغ از بند زن و اولاد شد
لا الٰہ باشد صدف گوہر نماز | قلب مسلم را حج اصغر نماز
در کف مسلم مثال خنجر است | قاتل فحشا و بغی و منکر است
روزہ بر جوع و عطش شبخوں زند | خیبر تن پروری را بشکند
مومناں را فطرت افروز است حج | ہجرت آموز و وطن سوز است حج
طاعتے سرمایہ جمعیتے، | ربط اوراق کتاب ملتے

حب دولت را فنا سازد زکوٰۃ
هم مساوات آشنا سازد زکوٰۃ

ایں همه اسباب استحکام تست
پختهٔ محکم اگر اسلام تست

اہل قوت شو ز وردِ یا قوی
تا سوار اشتر خاکی شوی

یہ ہیں مراحل جو خودی کی تربیت کے لئے ضروری ہیں اور جن کے طے کرنے پر نیابت الٰہی کا حصول ممکن ہے۔ اب ان ذوات مقدسہ کا ذکر سنئے جنھوں نے آئین مصطفوی کی متابعت میں ان مدارج عالیہ کو طے کیا ہے اور جن کی زندگیاں مسلمانوں کے لئے کیا تمام بنی نوع انساں کے لئے مشعل ہدایت کا کام دیتی ہیں۔ نیابت الٰہی کے مدارج بیان کرنے کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال حضرت علیؓ کے اسمائے کے اسرار اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

مسلم اول شہ مرداں علیؓ
عشق را سرمایہ ایماں علیؓ

از رخ او فال پیغمبر گرفت
ملّتِ حق از شکوہش فر گرفت

مرسلِ حق کرد نامش بوتراب
حق یداللہ خواند در اُمّ الکتاب

خاک تاریکے کہ نام او تن است
عقل از بیداد او در شیون است

شیر حق ایں خاک را تسخیر کرد
ایں گل تاریک را اکسیر کرد

زیر پائش اینجا شکوہ خیبر است
دست او آنجا قسیم کوثر است

ذات او دروازہ شہر علوم
زیر فرمانش حجاز و چین و روم

حضرتِ علیؓ کی عظمت و شان بیان کرنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر صاحب بنی نوع انسان کی بزرگی کا راستہ ان کی پیروی میں بتلاتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

مرد کشور گیر از کرّاری است
گوہرش را آبرو خودداری است

ہر کہ در آفاق گردد بوتراب
باز گرداند ز مغرب آفتاب

ہر کہ زیں بوم کب تن تنگ بست | چوں نگیں بر خاتم دولت نشست
حکمراں باید شدن بر خاک خویش | تا مے روشن خوری از تاک خویش
از گل خود آدمے تعمیر کن | آدمے را عالمے تعمیر کن
در عمل پوشیدہ مضمون حیات | لذت تخلیق قانون حیات
خیز و خلاق جہاں تازہ شو | شعلہ در برکن خلیل آوازہ شو
ممکنات قوت مردان کار | گردد از مشکل پسندی آشکار

عورتوں کے لئے حضرت علیؓ کی مردانہ زندگی اسوہ کاملہ نہیں ہو سکتی اسلئے عورتوں کے لئے حضرت فاطمہ زہراؓ کی زندگی کو اسوہ کاملہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

(۱) مریم از یک نسبت عیسیٰ عزیز | از سہ نسبت حضرت زہرا عزیز
نور چشم رحمۃ اللعالمین | آں امام اولیں و آخریں
آں کہ جان در پیکر گیتی دمید | روزگار تازہ آئین آفرید
(۲) بانوے آں تاجدار ہل اتیٰ | مرتضیٰ مشکل کشا شیر خدا
پادشاہ و کلبۂ ایوان او | یک حسام و یک زرہ سامان او
(۳) مادر آں مرکز پرکار عشق | مادر آں کارواں سالار عشق
آں یکے شمع شبستان حرم | حافظ جمعیت خیر الامم
تا نشیند آتش پیکار و کیں | پشت پا زد بر سر تاج و نگیں
واں دگر مولائے ابرار جہاں | قوت بازوئے احرار جہاں
نوری و ہم آتشی فرمانبرش | گم رضایش در رضائے شوہرش
آں ادب پروردۂ صبر و رضا | آسیا گرداں و لب قرآں سرا
اشک او برچید جبریل از زمیں | ہمچو شبنم ریخت بر عرش بریں

رشتۂ آئین حق زنجیر پاست | پاس فرمان جناب مصطفےٰ است
ورنہ گرد تربتش گردیدمے | سجدہ ہا بر خاک او پاشیدمے

اور چونکہ

قوم را سرمایہ اے صاحب نظر | نیست از نقد و قماش و سیم و زر
مال او فرزند ہائے تندرست | تر دماغ و سخت کوش و چاق چست

اور پھر چونکہ اس دولت کا کھوٹا اور کھرا ہونا ماؤں پر منحصر ہے :۔

سیرت فرزندہا از امہات | جوہر صدق و صفا از امہات

اسلئے ماؤں کے لئے اسوۂ کاملہ کے طور پر حضرت فاطمہ زہرا کو پیش کیا ہے۔

مزرع تسلیم را حاصل بتول | مادراں را اسوہ کامل بتول

حضرت فاطمہ زہرا کی زندگی کا عورتوں کے لئے اسوۂ کاملہ ہونے کی حیثیت اس سے اور بلند ہو جاتی ہے کہ اس مخدومہ عالم کے دونوں فرزندوں کی زندگیاں قوم و ملت کی بقا کے لئے ہدایت کے روشن ستارے ہیں جو اپنی روشنی سے اب بھی ملت کے لئے رہنمائی کا باعث ہیں حضرت امام حسنؓ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ ملت اور قوم کے اتحاد اور جمعیت کے لئے سرداری اور ظاہری وجاہت حتیٰ کہ نگین حکومت سے بھی دستکش ہو جانا اس سے بہتر ہے کہ ملت کی شیرازہ بندی منتشر ہو جائے اور آپس میں کشت و خون کا بازار گرم ہو۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

آں یکے شمع شبستان حرم | حافظ جمعیت خیر الامم
تا نشیند آتش پیکار و کیں | پشت پا زد بر سر تاج و نگیں

حضرت امام حسینؓ کی زندگی سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اگر ملت کا قائد یا نام نہاد خلیفہ آئین مصطفوی سے اپنا رشتہ توڑ دیتا ہے تو سچے مسلمان کا سر اس کی اطاعت سے اپنے کو پابند نہیں کرتا۔ چنانچہ امام حسینؓ کی شان میں فرماتے ہیں۔

آں امام عاشقاں پور بتول — سرو آزادے ز بستان رسول

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر — معنی ذبح عظیم آمد پسر

بہر آں شہزادۂ خیر الملل — دوش ختم المرسلیں نعم الجمل

درمیان امت آں کیواں جناب — ہمچو حرف قل ہو اللہ در کتاب

چوں خلافت رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت

خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم

بر زمین کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت

تا قیامت قطع استبداد کرد — موج خون او چمن ایجاد کرد

بہر حق در خاک و خوں غلطیدہ است — پس بنائے لا الہ گردیدہ است

سر ابراہیم و اسماعیل بود — یعنی آں اجمال را تفصیل بود

عزم او چوں کوہساراں استوار — پایدار و تند سیر و کامگار

تیغ بہر عزت دین است و بس — مقصد او حفظ آئین است و بس

ما سوا اللہ را مسلمان بندہ نیست — پیش فرعونے سرش افگندہ نیست

تار ما از زخمۂ اش لرزاں ہنوز — تازہ از تکبیر او ایماں ہنوز

اے صبا اے پیک دور افتادگاں — اشک ما بر خاک پاک او رساں

رسولؐ اکرم کی محبت اور انکی پیروی ہماری دینوی اور آخری نجات کا باعث ہے اور ان حضرات کو بھی ہم رسولؐ اکرم کیساتھ لفظ پنج تن پاک سے یاد کرتے ہیں انکی پیروی بھی ہمارے لئے ویسے ہی دینوی اور آخری نجات کا باعث ہے کیوں نہ ہو۔ یہی حضرات ہیں جنھوں نے رسولؐ اکرم کی پاک صحبت میں پرورش پائی تھی جوان کی گود میں پلے تھے۔ جنھوں نے براہ راست ہمارے رسولؐ سے تعلیم پائی تھی جن کی رگوں میں ہمارے رسولؐ کا خون تھا جو ان صورت اور سیرت پر پلے بڑھے تھے اور جو رسول اکرم کے بعد ان کے اسوہ کاملہ کی دلیل

ہدایت ہیں ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں۔

از دلاے دود مانش زندہ ام　　　　در جہاں مثلِ گہر تابندہ ام

اقبال

(محمد رضا علی خاں صاحب ایم ۔ اے ۔ ال ال، بی (علیگ) ایڈووکیٹ ہائی کورٹ جبلپور)

صدر محترم و حضرات

اخبارات میں اقبال ڈے کے متعلق اعلانات اور لاہور و دہلی جیسے مرکزی مقامات پر اس روز کی تیاریوں کے حالات نظر سے گذر رہے تھے ۔ مگر لٹریری کارپوریشن کے ارکان کی سرگرم کوششوں اور ادب دوست حضرات کی ہمت افزائی سے یہاں بھی یہ مجلس آراستہ ہوئی ۔ ہمیں مسرت ہے کہ جبلپور بھی آج اس تقریب سعید میں شامل ہے ۔

بے اختیار دل چاہتا ہے کہ ارکان لٹریری کارپوریشن کا شکریہ تو ادا کیا جائے ۔ مگر علمی خدمت کرنیوالے ان رسمیات سے بالاتر ہوتے ہیں اس لئے میں یہ نہیں چاہتا کہ ان تکلفات میں الجھ کر ان کو تکلیف پہنچاؤں ۔ مجھے اس موقعہ پر کچھ عرض کرنے کی فرمایش کی گئی تھی ۔ میں نے معذرت طلب کی ۔ مگر ایک پیش نہ گئی ۔ اور مجھ جیسے عزلت نشین کو آپ کے سامنے کھڑا ہونا پڑا ۔ بہرحال تعمیل حکم ضروری ہے ۔

جس تقریب میں ہم آپ سب جمع ہوئے ہیں وہ اقبال ڈے ہے جس کے منانے کی ایک صورت تو یہی ہے کہ سب تھوڑی دیر کے لئے جمع ہوئے ۔ تھوڑی بہت گفت وشنید کی اور اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے ۔ لوگ زیادہ جمع ہوئے اور محفل گرم ہوئی تو کہا کہ اقبال ڈے کامیاب ہوا ۔" اور "بالخیر وشما بسلامت" کہہ کر روزانہ کی یکسو ویکساں (سپاٹ) زندگی میں محو ہو گئے ۔

حضرات زندہ قومیں اپنے مشاہیر کے پیغام کی تبلیغ واشاعت جس پیمانہ پر کرتی ہیں اس کی تفصیل کا

یہاں نہ موقع ہے نہ وقت' بادی النظر میں یہ ایک غیر ضروری ہنگامہ معلوم ہوتا ہوگا۔ مگر اس قسم کی تقریبات ملک و قوم کی یکساں اور افسردہ زندگی میں حیات تازہ کی پیغامبر ہوتی ہیں۔ آپ گھبرائیں نہیں۔ میں آپ سے یہ نہ کہوں گا۔ کہ آپ روزانہ اقبال ڈے منایا کریں۔ لیکن یہ ضرور عرض کروں گا۔ کہ اقبال جیسے زبردست بین الاقوامی شہرت کے شاعر اور بلند پایہ مفکر کے پیغام کو زیادہ نہیں۔ کبھی فرصت کے لمحات میں غور سے مطالعہ کریں۔

اقبال ڈے" انٹر کالج مسلم برادرہڈ" لاہور کی تحریک پر ملک کے طول و عرض میں منایا جا رہا ہے۔ نوجوانان ملک کی یہ تحریک قابل صد ستایش ہے۔ میں نے بھی اس موقعہ پر یہ مناسب سمجھا۔ کہ اقبال نے جو پیغام نوجوانانِ ملک و قوم کے نام بالواسطہ یا بلا واسطہ دیا ہے۔ آج کی صحبت میں اس کے متعلق کچھ عرض کروں۔ ویسے بھی اقبال کے مخاطب صحیح نہ بچے ہیں نہ بوڑھے بلکہ اُس کے مخاطب صحیح نوجوانانِ ملک و قوم ہیں جن کے دامن سے ملک کی فلاح وابستہ ہے۔ اقبال کی شاعری کا دور جیسا کہ ظاہر ہے اس صدی کی ابتدا سے شروع ہوتا ہے۔ اور جس طرح بتدریج حوادث و واقعات نئی نئی تحریکیں وقوع پذیر ہوئیں اقبال کو بھی اس خاص زمانہ کی رہنمائی کے لئے بصیرت ملتی رہی۔ شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۵ء میں ختم ہوتا ہے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ان کے قیام یورپ کا زمانہ ہے۔ یہ اون کی شاعری کا دوسرا دور ہے۔ تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہو کر ۱۹۲۷ء پر ختم ہوتا ہے۔ چوتھا دور ۱۹۲۸ء سے شروع ہوا ہے۔ اور بالِ جبریل اور ضربِ کلیم اس پر آشوب دور میں ہمیں نشان راہ بتاتی ہیں۔

حضرات۔ قوموں اور ملکوں کی زندگی میں جوانوں کو جو مرتبہ حاصل ہے اُس سے کسے انکار ہو سکتا ہے۔ جوانوں سے میری مراد وہ ہیں کہ جو ابھی علم و ہنر کی صبر آزما منزلیں طے کر رہے ہیں۔ اور وہ بھی ہیں کہ جو اس کشاکش حیات میں شامل ہو چکے ہیں۔ مگر جن کی زندگی کا آفتاب ابھی نصف النہار پر ہے۔ اس صدی کے آغاز پر یعنی آج سے چالیس سال قبل ہم نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا۔ کہ وہ زمانہ مقابلتہً بہت عافیت کا تھا۔ نہ یہ امن سوز تحریکیں تھیں اور نہ لذت پرستی و بے کاری کا زور تھا۔

اقبالؔ کے دور اول کی شاعری اگرچہ مناظر قدرت کی مصوری ہے۔ مگر ان کی دور رس نگاہوں سے آنے والے واقعات مخفی نہیں ہیں۔

زیادہ وضاحت کے لئے عرض کروں گا۔ کہ ان کی شاعری ورڈس ورتھ (Wordsworth) کی شاعری ہے۔ قدرتی مناظر کو جس شگفتہ زبان میں ادا کیا ہے۔ انہیں کا حصہ ہے۔ کہیں "ہمالیہ" سے خطاب ہے۔ کہیں "گلِ رنگیں" سے اس طرح ہم کلام ہیں۔

کام مجھ کو دیدۂ حکمت کے الجھیڑوں سے کیا   دیدۂ بلبل سے میں کرتا ہوں نظارہ تیرا

کبھی "ابر کہسار" کی زبان سے یوں گہربار ہیں۔

دور سے دیدۂ امید کو ترساتا ہوں   کسی بستی سے جو خاموش گذر جاتا ہوں

سیر کرتا ہوا جس دم لبِ جو آتا ہوں   بالیاں نہر کو گرداب کی پہنا تا ہوں

سبزۂ مزرعۂ نوخیز کی اُمید ہوں میں   زادۂ بحر ہوں پروردۂ خورشید ہوں میں

چشمۂ کوہ کو دی شورش قلزم میں نے   اور پرندوں کو کیا محو ترنم میں نے

سر پہ سبزہ کے کھڑے ہو کے کہا قم میں نے   غنچۂ گل کو دیا ذوق تبسم میں نے

فیض سے میرے نمونے ہیں شبستانوں کے   جھونپڑے دامن کہسار میں دہقانوں کے

"آفتاب" "ایک آرزو" اسی رنگ میں بہت کامیاب اور بے مثل نظمیں ہیں۔ یہ مناظر فطرت کی مصوری کا دور ہے۔ کہیں کہیں اقبالؔ بچوں سے گویا ہیں۔ اور بہت سی مفید باتیں کہہ جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ نظمیں بچوں کے لئے مخصوص ہیں جن میں بچوں کو لطف اور دلچسپ قصوں کے پیرایہ میں اخلاقی سبق ذہن نشین کراتے ہیں۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے   آتے ہیں جو کام دوسروں کے

دوسری جگہ کہتے ہیں

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں   کوئی برا نہیں ہے قدرت کے کارخانے میں

ورڈس ورتھ (Wordsworth) کے خیال کے موافق اقبال بھی طفل شیرخوار کو تجلیات الٰہی کا حامل سمجھتے ہیں۔ اور اس نو وارد اقلیم غم کو یوں خطاب کرتے ہیں۔

تیرا آئینہ تھا آزاد غبار آرزو   آنکھ کھلتے ہی چمک اٹھا شرار آرزو

(ode to immortality) میں جو ورڈس ورتھ (Wordsworth) نے کہا تھا۔ وہ اقبال نظم "بچہ و شمع" میں کہہ اُٹھتے ہیں۔

اس نظارہ سے تیرا ننھا سا دل حیران ہے   یا کسی دیکھی ہوئی شے کی مگر پہچان ہے
شمع ایک شعلہ ہے لیکن تو سراپا نور ہے   آہ اس محفل میں یہ عریاں ہے تو مستور ہے
دست قدرت نے اسے کیا جانے کیوں عریاں کیا   تجھ کو خاک تیرہ کے فانوس میں پنہاں کیا

ابھی میں یہ عرض کر رہا تھا۔ کہ دور اوّل کے ابتدائی حصے میں دل چسپ قصوں کے پیرایہ میں اخلاقی سبق بچوں کے ذہن نشین کرائے گئے ہیں۔ مگر وہ بچے اب بڑے ہو چکے ہیں۔ استطاعت اور صلاحیت کے حامل ہیں۔ شاعر بھی ساتھ ساتھ اسی دور کے آخر حصے میں انداز بیان بدل دیتا ہے۔ "تصویر درد"۔ "نالہ فراق" "قومی گیت" "التجائے مسافر" اسی دور کی نظمیں ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ غزلیں ہیں جن میں نوجوانوں کے لئے بہت سے جواہر ریزے ملتے ہیں۔ کہیں طلب علم کی تکرار ہے۔ کہیں ذوق عمل پر اصرار ہے۔ کہیں اخلاقیات کا درس ہے۔ کلام کا دوسرا دور زیادہ تر قیام یورپ کے زمانہ کا ہے۔ یہ زمانہ اقبال کے لئے سخت امتحان کا دور ہے۔ مگر وہ اس آزمایش میں پورے اُترتے ہیں۔ اپنی تہذیب پر قایم ہیں۔ مگر عصبیت سے دور ہیں۔ شراب علم کی لذت سے پورے طور پر مستفید ہوتے ہیں۔ مگر لگا رخانۂ وطن سے اور زیادہ جذب بڑھ جاتا ہے۔ یہ وطن کی تہذیب اور روایات سے بیزار نوجوانوں کے لئے بہت غور کا مقام ہے اس دور میں اقبال ایک پیغام گو ہیں۔ "طلبا علی گڑھ کالج کے نام" سے ابتدا ہوتی ہے۔ نوجوانوں کو پیغام دیتے ہیں "پیام عشق" اور "عبدالقادر کے نام" اسی سلسلہ کی کڑیاں ہیں۔ ان دونوں مشہور نظموں کا ایک ایک شعر عمل کا پیغام ہے۔

اہل محفل کو دکھا دیں اثر صیقل عشق　　سنگِ امروز کو آئینۂ فردا کر دیں
اس چمن کو سبق آئین نمو کا دیکر　　قطرۂ شبنم بے مایہ کو دریا کر دیں

تیسرا دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوکر ۱۹۲۶ء ۱۹۳۲ء پر ختم ہوتا ہے۔ اوپر عرض کرچکا ہوں کہ یہ دور یورپ سے واپسی کے بعد شروع ہوا۔ ایک طرف اُنہوں نے اقوام یورپ کی بیداری سرگرمیٔ عمل علمی تحقیقات اور اُن کے نتائج کا غائر مطالعہ کیا دوسری طرف اہل وطن کی یہ حالت ہے۔ کہ عمل و تحقیقات سے دور ہیں۔ لذت پرستی کا زور ہے تقلید ذہنی غلامی میں الجھے ہوئے ہیں۔ یہی وہ زمانہ بھی ہے۔ جبکہ نہ صرف اون کے اہل وطن بلکہ اہل قوم بھی حوادث کا نشانہ بن چکے ہیں۔ نوجوانوں پر جمود و بے حسی طاری ہے۔ اقبال نے اون کو ڈھارس بندھائی۔ احساس زیاں سے واقف کیا۔ اسلاف کے کارنامے سنائے۔ اور غیرت دلائی۔ ناامیدی کو امید سے بدلا۔ "جواب شکوہ" میں اسلاف کے کارنامے محفوظ ہیں۔ "خطاب با جوانان اسلام" "غرہ شوال یا ہلال عید" میں انہوں نے دل سوزی کی ہے۔ اور دلوں کو تڑپایا ہے۔ "مسلم" "نوید صبح" "شعاع آفتاب" میں امید بندھائی ہے۔ "مسلمان اور تعلیم جدید" "مذہب" کے ذیل میں خطرات سے آگاہ کیا ہے۔ "طلوع اسلام" میں امید کا پیام دیا ہے۔ "خضر راہ" میں دنیا کے اہم مسائل کو پیش کیا ہے۔ انہیں مسائل پر دور چہارم میں۔ "بال جبریل" و ضرب کلیم میں مکمل روشنی ڈالی ہے۔ اور ان کو وضاحت سے حل کیا ہے۔ بال جبریل و ضرب کلیم میں زیادہ حصہ نوجوانوں کو پیغام پر وقف ہے۔ اقبال نے ان دونوں میں نوجوانوں کی ہر شعبۂ حیات میں رہنمائی کی ہے۔ تہذیب حاضر کے خطرات سے متنبہ کیا ہے۔ بال جبریل میں "ذوق و شوق" "جاوید کے نام" "ایک نوجوان کے نام" "پیر و مرید" ان تمام نظموں میں عزم و عمل کے مجسمے جوانان ملک کے سامنے پیش کئے ہیں۔ ضرب کلیم میں نوجوانوں کے متعلق وہ سب کچھ ہے جس کی اس ہنگامہ خیز زندگی میں ضرورت ہے۔ "تعلیم و تربیت" "مغربی تہذیب" "آزادی فکر" "طالب علم" "دین و تعلیم" "جاوید سے" "آزادی نسواں" میں محض دعوتِ فکر ہی نہیں دی ہے بلکہ نوجوانانِ ملک کے لئے ایک مستقل شاہراہ قائم کی ہے۔

اسی دور کے عمرانی اور سیاسی مسائل سے بھی نوجوانوں کو آگاہ کیا ہے۔ اور اُن کے مختلف

پہلوؤں کو اُجاگر کر کے آخری فیصلہ دیا ہے۔

اقبال کی شاعری کا مقصد گرمی محفل نہیں۔ اس نے نفسیات کا بہت گہرا مطالعہ کیا ہے۔ فلسفہ اور حکمت کی رگ و پے سے واقف ہے۔ دنیا کے حالات و تحریکات قوموں کے نشیب و فراز ان سب پر اوس کو بہت گہرا عبور ہے۔ اس لئے کوئی تعجب نہیں کہ وہ مستقبل کے واقعات اس طرح کہہ جاتا ہے گویا سب ہمارے سامنے گذر رہے ہیں خود کہتا ہے۔

مجھے رازِ دو عالم دل کا آئینہ دکھاتا ہے ۔۔۔ وہی کہتا ہوں جو کچھ سامنے آنکھوں کے آتا ہے

دوسری جگہہ بھی اسی کی تکرار ہے۔

جو ہے پردوں میں پنہاں چشم بینا دیکھ لیتی ہے ۔۔۔ زمانہ کی طبیعت کا تقاضا دیکھ لیتی ہے

ماں کی آغوش بچوں کا سب سے بڑا اور پہلا مکتب ہے۔ ہمارے بچوں کی جیسی ناقص ناگفتہ بہ ماحول میں نشو و نما ہوتی ہے۔ اُس کی تفصیل طوالت کے خیال سے نظر انداز کرتا ہوں۔

اقبال آج کے بچوں اور کل کے نوجوانوں کے دل میں جن بلند عزایم اور اعلیٰ خیالات کی روح پھونکتا ہے وُہ بچہ کی دعائیں شاعر مشرق کے لب اعجاز سے سُن لیجیے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنّا میری ۔۔۔ زندگی شمع کی صورت ہو خدایا میری

دور دُنیا کا میرے دم سے اندھیرا ہو جائے ۔۔۔ ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

ہو میرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت ۔۔۔ جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

زندگی ہو میری پروانہ کی صورت یارب ۔۔۔ علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

ہو میرا کام غریبوں کی حمایت کرنا ۔۔۔ دردمندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو ۔۔۔ نیک جو راہ ہو اُس رہ پہ چلانا مجھ کو

کیا کوئی اس سے بلند اور پاکیزہ زندگی کا نصب العین پیش کر سکتا ہے۔

حضرات ملک و قوم کی زندگی کے لئے سب سے پہلی چیز وحدت مقصد کا وجود ہے یہی وہ مرکزی

نقطہ ہے۔ جس کے اردگرد قوم کے تمام افراد کے اعمال چکر کھاتے ہیں۔ حکمراں اپنی حکومت کے تخت پر واعظ اپنے ممبر پر۔ سپاہی اپنے میدان میں اہل پیشہ اپنے بازار میں۔ عالم اپنی درس گاہ میں۔ صناع اپنی کارگاہ میں۔ اخبار نویس اپنے دفتر میں۔ یہاں تک کہ اوس کے مجرم اور ڈاکو بھی اپنی کمین گاہ میں اپنے دوسرے کاموں کے ساتھ اسی ایک مقصد کے لئے جیتے ہیں اور مرتے ہیں۔ اخلاق اور کیریکٹر کی مضبوطی جس کے بغیر کسی قوم وملک کی معنوی زندگی کا وجود ہی نہیں ہوسکتا۔ بہت کچھ اسی مقصد عزیز کی گراں تھا متاع کی حفاظت ترقی اور استواری کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ ایثار۔ قربانی۔ عزم و استقلال۔ فیاضی جوانمردی اسی طلسم کے روحانی اسرار ہیں یہ حقیقت میں وہ جرس ہے جس کی آواز پر نوجوانوں کے قافلے اپنے سفر طے کرتے ہیں اور کامیابی کی منزل کا پتہ لگاتے ہیں۔

وحدت مقاصد اور وحدت کردار لازم و ملزوم ہیں جو کہ نوجوانوں کی جدّوجہد کے بغیر کوئی مستقل صورت اختیار نہیں کرسکتے۔ اس بارگراں کے امانت دار نوجوان ہیں۔ آئیے اقبال سے سنئے کہ احساس فرض کی شاہراہ پر ڈالنے کے لئے نوجوانوں کو کس طرح تعلیم و تربیت کرتا ہے۔ اقبال نے نوجوانوں کے اخلاق کی تعمیر پر بہت زور دیا ہے۔ اخلاق کی تعلیم اوس کے نزدیک ازحد اہم وضروری ہے۔ پیام مشرق کے دیباچہ میں ایک جگہ لکھتا ہے "اقوام مشرق کو یہ محسوس کرلینا چاہئے کہ زندگی اپنی جوانی میں کسی قسم کا انقلاب نہیں پیدا کرسکتی۔ جب تک کہ پہلے اوس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو۔ کوئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کرسکتی۔ جب تک کہ اوس کا وجود انسانوں کے ضمیر میں متشکل نہ ہو۔ اخلاقی تعلیم میں نوجوانوں کو سب سے زیادہ خوداعتمادی پیدا کرنے پر زور دیا ہے۔ خوداعتمادی سے مقصود اپنے اندر فیصلہ کی قوت ہے۔ مستحکم عزم پیدا کرنا اور اس عزم کے مطابق خدا کے بعد خود اپنی ذات پر بھروسہ کرکے کام شروع کردینا اور اُس کو کامیابی تک پہونچانا ہے۔ خوداعتمادی وہ مرکزی نکتہ ہے جس کے بلند حوصلگی۔ جستجو۔ تلاش ذوق عمل۔ طلب علم۔ حلقے ہیں۔

اقبال کہتا ہے۔

آہ کس کی جستجو آوارہ رکھتی ہے تجھے ‏ ‏ راہ تو رہرو بھی تو رہبر بھی تو منزل بھی تو

ایک موقعہ پر عمل کی یہ تعلیم دیتے تھے۔

آتی تھی کوہ سے صدا راز حیات ہے سکون ‏ ‏ کہتا تھا مور ناتوان لطفِ خرام اور ہے

عمل کو زندگی کا جوہر اس طرح بتاتے ہیں۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے ‏ ‏ سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

اقبال ہر آزار کا مداوا جستجو سمجھتے ہیں۔

دوا ہر دکھ کی ہے مجروحِ تیغِ آرزو رہنا ‏ ‏ علاج زخم ہے آزادِ احسانِ رفو رہنا

جمود و بے حسی سے بیزار ہیں۔

ضمیر لالہ میں روشن چراغ آرزو کر دے ‏ ‏ چمن کے ذرّہ ذرّہ کو شہید جستجو کر دے

دوسری جگہ اس طرح کہتے ہیں۔

دے ولولۂ شوق جسے لذّت پرواز ‏ ‏ کرسکتا ہے وہ ذرّہ مہ و مہر کو تاراج

جرأت ہو نمو کی تو فضا تنگ نہیں ہے ‏ ‏ اے مردِ خدا ملک خدا تنگ نہیں ہے

جستجو و تلاش کا نقیب قناعت و توکل کو نوجواں کے لئے زہر ہلاہل سمجھتا ہے۔ ہمیشہ بلند حوصلگی اور جستجو کی تعلیم دیتا ہے۔

ہمتِ عالی تو دریا بھی نہیں کرتی قبول
غنچہ ساں غافل ترے دامن میں شبنم کب تلک

اقبال تقدیر کا قایل ہے۔ مگر عمل کی بے پناہ قوتوں کے اسرار نوجوانوں پر اس طرح فاش کرتا ہے۔

رازِ تقدیر ہے یہ راز جہاں تگ و تاز ‏ ‏ جوشِ کردار سے کھل جاتے ہیں تقدیر کے راز

ایک جگہ کہتے ہیں۔

آہ اس راز سے واقف ہے نہ ملا نہ فقیہہ ‏ ‏ وحدتِ افکار کی بے وحدتِ کردار ہے خام

اقبال نوا جوانوں کے خیالات اور افکار سے خوب واقف ہیں۔ اس لئے نوجوانوں کو جو زندگی کے شاہراہ بتائی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب ان ہی کا حصہ تھا۔

افکار جوانوں کے خفی ہوں کہ جلی ہوں | پوشیدہ نہیں مرد قلندر کی نظر سے
معلوم ہیں مجھ کو تیرے احوال کہ میں بھی | مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

اخلاق کی تعمیر میں کیرکٹر بہت نمایاں ہے۔ نوجوانوں کی آرام پسندی اور زندگی کی رنگینیوں کو سم قاتل بتاتے ہیں۔

تیرے سوفے ہیں افرنگی تیرے قالین ایرانی | لہو مجھ کو رلاتی ہے جوانوں کی تن آسانی
امارت کیا شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل | نہ زور حیدری تجھ میں نہ استغنائے سلمانی

اقبال کے نزدیک تعلیم جو مذہب سے خالی ہو نوجوانوں کے لئے مضر ہے۔

خوش تو ہیں ہم بھی جوانوں کی ترقی سے مگر | لب خنداں سے نکل جاتی ہے فریاد بھی ساتھ
ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم | کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
جب پیر فلک نے ورق ایام کا الٹا | آئی یہ صدا پاؤگے تعلیم سے اعزاز
پانی نہ ملا زمزم ملت سے جو اس کو | پیدا ہیں نئی پود میں الحاد کے انداز

تعمیر اخلاق میں اعلیٰ تعلیم و تربیت کا ذکر تھا۔ تعلیم و تربیت کی اہمیت جس قدر ہے محتاج بیان نہیں نئی نئی تحقیقاتیں ہو رہی ہیں۔ تعلیم کے مختلف نظریوں پر عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن اقبال کا خیال ہے۔ کہ اس تعلیم سے ذہنی و فکری بلندی اس وقت تک نصیب نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ مذہبی تعلیم اس کا جزو نہ ہو۔ تعلیم کے ذیل میں اقبال کا استفسار اور پیر رومی کا جواب سن لیجئے۔

مرید ہندی | چشم بینا سے ہے جاری جوئے خوں
علم حاضر سے ہے دیں زار و زبوں

پیر رومی | علم را بر تن زنی مارے بود
علم را بر دل زنی یارے بود

مریدِ ہندی۔ پڑھ لئے میں نے علوم شرق و غرب
روح میں باقی ہے اب تک درد و کرب

پیرِ رومی دستِ ہر نا اہل بیمارت کند
سوئے مادر آ کہ تیمارت کند

مریدِ ہندی علم و حکمت کا ملے کیونکر سراغ
کس طرح ہاتھ آئے سوزِ درد و داغ

پیرِ رومی علم و حکمت زاید از نان حلال
عشق و رقت آید از نان حلال

اقبالؔ چاہتے ہیں کہ نوجوانوں میں طلب علم کا صحیح جذبہ پیدا ہو۔ "طالب علم" کو خطاب کر کے کہتے ہیں۔

خدا تجھے کسی طوفان سے آشنا کر دے — کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں
تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو — کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

موجودہ طرز تعلیم سے وہ مطمئن نہیں ہیں۔ اُن کا خیال ہے۔ کہ موجودہ طرز تعلیم صحیح علمی مذاق پیدا نہیں کرتا۔

سُنئے۔

پختہ افکار کہاں ڈھونڈنے جائے کوئی — اس زمانہ کی ہوا رکھتی ہے ہر چیز کو خام
مدرسہ عقل کو آزاد تو کرتا ہے مگر — چھوڑ جاتا ہے خیالات کو بے ربط و نظام

اقبالؔ نوجوانوں کے لئے ایک آئیڈیل رہنما ہے۔ اس دور کے موجودہ نوجوانوں کو ملک کے قوانین کی پابندی ازبس ضروری سمجھتا ہے۔ خیالات کی آزادی کو جو کہ ملک اور سوسائٹی کے امن کو منتشر کرے وہ بہت برا سمجھتا ہے۔

گو فکرِ خدا داد سے روشن ہے زمانہ — آزادیٔ افکار ہے ابلیس کی ایجاد
آزادیٔ افکار سے ہے اُن کی تباہی — رکھتے نہیں جو فکر و تدبّر کا سلیقہ
دہر میں عیش دوام آئین کی پابندی سے ہے — موج کو آزادیاں سامانِ شیون ہو گئیں

اوپر عرض کر چکا ہوں کہ اقبالؔ نے ہوس پرستی اور زندگی کی رنگینیوں کی جا بجا مذمت کی ہے۔ ان کے نزدیک جوانوں کا اعلیٰ کیریکٹر دولتِ قارونؔ اور فکر افلاطون سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔
کہتے ہیں۔

ضمیر پاک نگاہ بلند مستیٔ شوق — نہ مال و دولت قارون نہ فکرِ افلاطون
نگاہ پاک ہے تیری تو پاک ہے دل بھی — کہ دل کو حق نے کیا ہے نگاہ کا پیرو

جاویدؔ کے نام لکھتے ہیں۔

حیا نہیں ہے زمانہ کی آنکھ میں باقی — خدا کرے کہ جوانی تیری رہے بے داغ

ساتھ ہی جاویدؔ کے نام ایک دوسرے خط کا حصّہ بھی ملاحظہ فرمایئے۔

خدا اگر دل فطرت شناس دے تجھ کو — سکوت لالہ و گُل سے کلام پیدا کر
میرا طریق امیری نہیں فقیری ہے — خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

نوجوانوں کے سامنے مسائل حاضرہ کو بھی پیش کیا ہے۔ اور دنیا کے بین الاقوامی مسائل کو جن کے سلجھانے میں آج بڑے بڑے دماغ غور و فکر میں لگے ہوئے ہیں حل کیا ہے۔ اس سے قبل کہ ان مسائل کو عرض کروں مختصراً یہ عرض کروں گا۔ کہ ہمیں یہ دیکھنا ہے۔ کہ اقبالؔ کا نظریہ خالص سیاسی ہے۔ یا اس کی بنیادیں اس سے بھی گہری ہیں۔ بعض مغربیؔ اور مشرقیؔ نقادؔ کہتے ہیں۔ کہ اقبال نے بہت حد تک ولیمؔ بلیک۔ نیٹشےؔ اور برگساںؔ سے استفادہ کیا ہے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقبالؔ اور نیٹشےؔ اقبالؔ اور برگساں میں بعض معاملات میں اتحاد خیال پایا جاتا ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ صرف معمولی سی وحدت خیال اس امر کے لئے ایک محکم ثبوت نہیں بن سکتی کہ اقبال نے تمام تر خیالات اِن فلسفیوں سے لئے ہیں۔

بلکہ اقبال بہت حد تک مغربی تخیل سے نفور ہیں۔ اقبال کو نیٹشے اور برگساں سے اکثر اہم معاملات میں اختلاف ہے جو اصولی حیثیت رکھتے ہیں۔ فارسٹر اور ڈکنسن کا یہ خیال ہے۔ کہ اقبال کا نظریہ سیاسی ہے۔ مگر یہ نظریہ بہت سطحی مطالعہ کی بنا پر قائم کیا ہے۔ اقبال اس سیاسیات سے متنفر ہے۔ جس میں مادیت کے عناصر اصولی اور اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کو شکایت ہے۔ کہ تہذیب جدید کے تمام شعبے مادیت اور عقلیت کے جراثیم سے متاثر ہیں۔ اقبال اوس کی مذمت کرتے ہیں۔ مگر یہ مذمت لینن۔ ایچ جی ویلز اور برنارڈشا کی مذمت سے جداگانہ ہے۔ اقبال ایک زندہ اور بہمہ وجوہ کامل سوسائٹی کی تعمیر کا خواب دیکھتا ہے۔ جو تہذیب حاضرہ موجودہ اندازِ خیال موجودہ جذبات اور ارادوں سے بالکل جدا ہوگی جس کے سب افراد مافوق الانسان ہوں گے۔ جو خدائے لم یزلی کے زیادہ قریب ہوں گے۔ یہ نئی سوسائٹی مساوات اور یک جہتی کا زندہ نمونہ ہوگی۔ اور اس میں مادیت اور عقلیت سے پیدا شدہ متذکرہ بالا نظریہ کے پیش نظر اقبال نے تہذیب حاضرہ کے مسائل کو حل کیا ہے۔ اور

اشتراکیت۔ ابی سینیا۔ جمہوریت۔ کارل مارکس مسولینی۔ جمعیت اقوام۔ سلطنت وغیرہ وغیرہ کو بیان کیا ہے۔ اور نوجوانوں کو دعوت فکر دی ہے۔

طوالت کے لحاظ سے میں نے ان مسائل کو جو اقبال نے پیش کئے ہیں۔ نظر انداز کیا ہے۔ لیکن ایک اہم مسئلہ پر ضرور کچھ عرض کروں گا۔ آزادی نسواں کا مسئلہ سب سے زیادہ نوجوانوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے۔ اقبال کا فیصلہ اس پر سن لیجئے۔

اس بحث کا کچھ فیصلہ میں کر نہیں سکتا — گو خوب سمجھتا ہوں کہ یہ زہر ہے وہ قند
کیا فائدہ کچھ کہہ کے بنوں اور بھی معتوب — پہلے ہی خفا مجھ سے ہیں تہذیب کے فرزند

آگے کہتے ہیں۔

اک زندہ حقیقت میرے سینہ میں ہے مستور — کیا سمجھے گا وہ جس کی رگوں میں ہے لہو سرد
نے پردہ نہ تعلیم نئی ہو کہ پرانی — نسوانیت زن کا نگہباں ہے فقط مرد

جس قوم نے اس زندہ حقیقت کو نہ پایا   اُس قوم کا خورشید بہت جلد ہوا زرد

حضرات اقبالؔ نے نوجوانوں کے لئے ایک لائحہ عمل قائم کیا ہے۔ اوس کی آرزو ہے۔ ان کے دلوں کے تاریک گوشوں سے نفاق اور اختلاف کی سطوت اور تسلّط کا خاتمہ ہو۔ اور وہ زندگی اور بیداری کی راہوں کو اختیار کر کے اس پرشور زندگی میں کامیاب ہوں۔ نوجوانوں کے لئے۔ خداوند جلّ شانہٗ کی بارگاہ میں دعائیں مانگی ہیں۔ آہِ سحرگاہی اُن کے لئے وقف ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ نوجوان بھی ستارہ صبح کے ساتھ بیدار ہوں۔ ساقی نامہ میں دعا سنئے۔

جگر سے وہی تیر پھر پار کر   تمنّا کو سینوں میں بیدار کر
تیرے آسمانوں کے تاروں کی خیر   زمینوں کے شب زندہ داروں کی خیر
جوانوں کو سوزِ جگر بخش دے   میرا عشق میری نظر بخش دے

ایک جگہ کہتا ہے۔

نہیں ہنگامۂ پیکار کے لایق وہ جوان   جو ہوا نالۂ مرغانِ سحر سے مدہوش

نوجوانوں کو اقبالؔ کی یہ تلخ نوائی شاید بارِ خاطر ہوئی ہوگی۔ مگر صدقِ مقال وحق گوئی اس کا عقیدہ ہے۔ نوجوانوں کو خود بھی صدقِ مقالی اپنا وظیفہ حیات بنانا چاہتا ہے۔ اقبالؔ خود بھی اپنی تلخ نوائی سے واقف ہے۔

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق   نہ ابلہ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہرِ ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

ضربِ کلیم میں محراب گل افغاں کے افکار میں اقبال نے ایک آئیڈیل نوجوان پیش کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا   شباب جس کا ہے بے داغ ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ تو شیرانِ غاب سے بڑھ کر   اگر ہو صلح تو رعنا غزالِ تاتاری

عجب نہیں ہے اگر اس کا سوز ہے ہمہ سوز　　کہ نیستاں کے لئے بس ہے ایک چنگاری
خدا نے اس کو دیا ہے شکوہ سلطانی　　کہ اوس کے فقر میں ہے حیدری و کراری
نگاہ کم سے نہ دیکھ اوس کی بے کلاہی کو　　یہ بے کلاہی ہے سرمایۂ کلاہ داری

اقبال ہماری موجودہ دنیا میں زندگی کا سفیر ہے ۔
ایک دوسرے مقام پر کہتے ہیں ۔

محبت مجھے اُن جوانوں سے ہے　　ستاروں پہ جو ڈالتے ہیں کمند
اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت　　دے اُن کو سبق خود شکنی خود نگری کا

حضرات! نوجوانوں سے خطاب ہے ۔ کون نہیں جانتا کہ اس عرصہ کائنات میں زندگی کا ایک معرکہ برپا ہے ۔ اور ہر ایک مخلوق اپنے جینے اور بڑھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے ۔ قومیں اس دوڑ میں مصروف ہیں ۔ افراد اس مسابقت میں سرگرم ہیں ۔ وہی زندہ اور جیتا رہے گا جو اپنی محنت اور کوشش سے اس بازی کو جیتے گا ۔ اور جس نے ہاتھ پاؤں ڈال دیئے اور نرم بستر کا جویا ہوا دنیا اُس کو مردہ سمجھ کر ایک گوشہ میں ڈال دے گی اور افراد اور قومیں اُس کو روندتی ہوئی آگے بڑھ جائیں گی زندگی کا فلسفہ صرف جدوجہد محنت اور سخت کوشی ہے ۔ بھوک کی برداشت شکم سیری کا سامان ہے ۔ اور موت کی تلاش زندگی کا سرچشمہ ہے ۔

آج اقبال کی نظریں نوجوانوں پر ملک کی ترقی کے لئے لگی ہوئی ہیں ۔

اقبال اور عشقِ رسول

(شیخ عطاء اللہ صاحب ادارۂ معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)

یوم اقبال حقیقت میں ملّت اسلامیہ کے لئے پیام اقبال ہے۔

مژدہ اے پیمانہ بردارِ خمستانِ حجاز　　بعد مدت کے ترے رندوں کو پھر آیا ہے ہوش

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے اُس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنے اقبال و وقار کو پہچاننے کی توفیق بخشی۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس گئے گذرے زمانے میں ملّتِ بیضا کی عزیز ترین ہستیوں میں سے ہیں اور اپنے آپ کو ملّت بیضا کی خاک پا سمجھتے ہیں، پس ایسی مقدس خاک کے سرمے سے مسلمان کی آنکھیں بہت پہلے سے روشن ہوجانی چاہئیں تھیں خیر اگر اب بھی صدیوں کی کوری اور کور بختی سے نجات ملے تو ایسا غنیمت ہے۔

من کہ این شب را چوں ماہ آراستم　　گردِ پائے ملّتِ بیضا ستم

اے کہ زمن فزودۂ گرمی آہ و نالہ را　　زندہ کن از صدائے من خاکِ ہزار سالہ را

آج کے دن ہمیں اللہ تعالےٰ کے حضور میں سربسجود ہوکر پورے خضوع وخشوع سے دعا مانگنی چاہئے کہ اللہ تعالےٰ علامہ ممدوح کو کلی صحت بخشے اور وہ عرصہ تک ملّت اسلامیہ کی خدمت کے لئے زندہ رہیں

علّامہ اقبال کا مرتبہ تاریخ شعر و ملّت میں نہایت بلند ہے اُن کا کلام کئی قسم کی کشش اپنے اندر رکھتا ہے۔ اُن کے کلام سے اُن کے جذبات اور احساسات کا پتہ لگانا نہایت سہل ہے ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں آج اقبال کے شیدائی مختلف عنوانات سے اُس کی ذات و شعر پر مقالات پڑھیں گے۔ اقبال اور وطن۔ اقبال اور اشتراکیت۔ اقبال اور شعر۔ اقبال اور مومن۔ اقبال اور قلندر و درویش۔ اقبال اور مشرق۔ اقبال اور افرنگ کتنے ہی مضامین ہیں جن پر لکھنے کو

جی چاہتا ہے لیکن میں نے بلا تامل اقبال اور عشقِ رسول اپنے مقالہ کا عنوان قرار دیا ہے کیونکہ میں اسی موضوع کو علامہ اقبال کی شاعری کی قوت محرکہ اور زندگی کا سرمایہ سرور سمجھتا ہوں۔

اقبال بزبانِ اقبال

نفس مضمون کی طرف متوجہ ہونے سے پیشتر میں مختصر طور پر بتانا چاہتا ہوں کہ اقبال کون اور کیا ہیں لیکن یہ نہیں کہ کہاں پیدا ہوئے کس جگہ تعلیم پائی اُن کے اُستاد کون بزرگ تھے اگرچہ مجھے مولوی میر حسن صاحب کی خدمت میں ۱۹۱۵-۱۶ء تک بسلسلہ ملازمت مرے کالج حاضری کا شرف نصیب ہوا۔ اُستاد کو دیکھا اور شاگرد کو پڑھا ہے اقبال کی احساس شناس طبیعت نے خوب اعتراف کیا ہے جب یہ کہا ہے۔

مجھے اقبال اُس سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے

اقبال کے تعارف سے مراد اُس کے احساسات اور جذبات اُس کی اُمیدوں اور آرزوں کا اظہار ہے اقبال ہندو الاصل صاحب بصیرت مسلمان اور ایک مردِ حق آگاہ ہے جس کی آرزو قرن اول کی شان اسلامی کا دوبارہ ظہور ہے وہ کشمیری الاصل ہیں ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ دنیاوی حالات نے مساعدت نہیں کی۔ خدا نے اُنھیں ایک بینوا درویش پیدا کیا۔ ایک سید زادے سے خطاب ہوتا ہے۔

میں اصل کا خاص سومناتی — آبا میرے لاتی و مناتی
تو سید ہاشمی کی اولاد — میری کفِ خاک برہمن زاد

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے

بیا بنگر کہ در ہندوستاں دیگر نمی بینی — برہمن زادۂ رمز آشنائے روم و تبریز است

اسلام اور ملت اسلامیہ سے اپنی شیفتگی کو یوں بیان فرماتے ہیں۔

اگرچہ زادۂ ہندم فروغِ چشمِ من است — ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز
[illegible] — چکیدہ از لبِ من آنکہ در دلِ حرم است

کشمیر آبائی وطن

اقبال کو اپنے آبائی وطن سے محبت ہے اور اس کا اظہار جا بجا ہوتا ہے لیکن اسلام کی نسبت ایک سچے مسلمان کی طرح ہر دوسری نسبت پر غالب ہے۔

تنم گلے ز خیابانِ جنتِ کشمیر ۔۔۔ دل از حریم حجاز و نو از شیراز است

کم سنی میں کشمیر کی نسبت نہایت عزیز تھی۔

موتی عدن سے لعل ہوا ہے یمن سے دور ۔۔۔ یا نافۂ غزال ہوا ہے ختن سے دور
ہندوستاں میں آئے ہیں کشمیر چھوڑ کر ۔۔۔ بلبل نے آشیانہ بنایا چمن سے دور

کشمیر کا چمن جو مجھے دل پذیر ہے ۔۔۔ اس باغ جانفزا کا یہ بلبل اسیر ہے
ورثہ میں ہم کو آئی ہے آدم کی جائداد ۔۔۔ جو ہے وطن ہمارا وہ جنت نظیر ہے

کشمیر جنت نظیر کی تعریف اقبال نے دل کھول کر لکھی ہے۔ وجد انگیز اشعار ہیں۔ کشمیر کو دنیا نے جنت نظیر کہا اور شعرا کا یہ فیصلہ بلا دلیل صدیوں قائم رہا اقبال سے پہلے کشمیر کی سب سے بڑی تعریف یہ تھی ؎

اگر فردوس بر روے زمین است ۔۔۔ ہمین است و ہمین است و ہمین است

لیکن کشمیر کے فردوس ہونے کا ثبوت علامہ ہی نے بہم پہنچایا ہے اور میں سمجھتا ہوں اب دین دنیا تک کشمیر کی اقبالی تعریف قطعی چیز ہو گی۔

تو گوئی کہ یزداں بہشتِ بریں را ۔۔۔ نہادست در دامنِ کوہسارے
کہ تا رحمتش آدمی زادگاں را ۔۔۔ رہا سازد از محنتِ انتظارے

شاعری اور پیام اقبال

اقبال جیسا سخنور اور اس کے مدعاے شاعری کے ساتھ آج تک پیدا نہیں ہوا۔ اقبال کی شاعری

اسلام کا ایک پیامِ حیات افروز اور دنیائے ادب کا ایک انقلاب ہے۔

نہ بینی خیر ازاں مردِ فرودست ___ کہ برمن تہمت شعر و سخن بست

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری ___ وگرنہ شعر میرا کیا ہے شاعری کیا ہے

گل و بلبل کی شاعری چاہنے والوں سے گلہ ہے۔

آشنائے من زمن بیگانہ رفت ___ از خمستانم تہی پیمانہ رفت

من شکوہ خسروی او را دہم ___ تخت کسریٰ زیر پائے او نہم

او حدیثِ دلبری خواہد زمن ___ رنگ و آبِ شاعری خواہد زمن

کم نظر بیتابیٔ جانم ندید ___ آشکارم دید و پنہانم ندید

پیامِ مشرق کے انتساب منظوم میں گوئٹے اور اپنا مقابلہ کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

او چمن زادے چمن پروردۂ ___ من دمیدم از زمینِ مردۂ

اپنی زندگی کے مختلف اعتبارات کو یکجا کر دیا ہے۔

کوئی دیکھے تو میری بے نوازی ___ نفس ہندی مقامِ نغمہ تازی

نگہ آلودۂ اندازِ افرنگ ___ طبیعت غزنوی قسمت ایازی

اقبال کو ہمیشہ اپنے دردِ نہاں کے محرم کی تلاش رہی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ محفل آن کے رازداروں سے خالی ہے۔

اقبال اپنا محرم ملتا نہیں جہاں میں ___ معلوم کیا کسی کو دردِ نہاں ہمارا

تابِ گفتار اگر ہست شناسائے نیست ___ وائے آں بندہ کہ در سینہ او رازے ہست

من مثالِ لالۂ صحرا ستم ___ در میانِ محفلے تنہا ستم

دعا کرتے ہیں۔

خواہم از لطفِ تو یارِ ہمدمے ___ از رموزِ فطرتِ من محرمے

ہمدمے دیوانۂ فرزانہ ... از خیال این و آں بیگانۂ
تا بجان او سپارم ہوئے خویش ... باز بینم در دلِ او روئے خویش
سازم از مشتِ گلے خود پیکرش ... ہم صنم او را شوم ہم آذرش

ملتِ اسلامیہ سے اپنی شاعری اور اُس کی غایت کے متعلق خطاب ہوتا ہے۔

ہمنوا از جلوۂ اغیار گفت ... داستانِ گیسوئے و رخسار گفت
بر درِ ساقی جبیں فرسوداو ... قصۂ مغ زادگاں پیمودہ او
من شہیدِ تیغ ابروئے توام ... خاکم و آسودۂ کوئے توام
از ستائش گستری بالاترم ... پیش ہر دیواں فرو ناید سرم
از سخن آئینہ سازم کردہ اند ... وز سکندر بے نیازم کردہ اند
بر درت جانم نیاز آوردہ است ... ہدیہ سوز و گداز آوردہ است
ز آسماں آبگوں یم می چکد ... بر دلِ گرمم دما دم می چکد
من ز جو باریک تر می سازمش ... تا بہ صحنِ گلشنت اندازمش

وجہ کیا پیاری ہے۔

زانکہ تو محبوبِ یارِ ماستی ... ہم چو دل اندر کنارِ ماستی
مثلِ گل از ہم شگافم سینہ را ... پیش تو آویزم ایں آئینہ را

مدعا کیا ہے۔

تا نگاہے افگنی بر روئے خویش ... می شوی زنجیری گیسوئے خویش
جانم اندر پیکرے فرسودہ ... جلوۂ آہے است گرد آسودہ
چوں مرا صبحِ ازل حق آفرید ... نالہ در ابریشمِ عودم تپید
نالۂ افشا گر اسرارِ عشق ... خونبہائے حسرتِ گفتارِ عشق

فطرتِ آتش دہد خاشاک را
شوخیِ پروانہ بخشد خاک را

من ہمیں یک گل بدستارت زنم
محشرے بر خوابِ سرشارت زنم

تا ز خاکت لالہ زار آید پدید
از دمت بادِ بہار آید پدید

مختلف قلبی کیفیتوں کو یوں بیان فرمایا ہے

عیبِ من کم جوئے و از جام عیار خویش گیر
لذت تلخابِ من بے جاں غم فرسودنے

ہیچ کس رازے کہ من گویم نہ گفت
ہمچو فکر من دُرِ معنی نہ سفت

سرِّ عیشِ جاوداں خواہی بیا
ہم زمیں ہم آسماں خواہی بیا

پیر گردوں با من ایں اسرار گفت
از ندیماں رازہائے نتواں نہفت

حق رموزِ ملک و دیں بر من کشود
نقشِ غیر از پردۂ چشمم ربود

آرزو

جوانوں کو مری آہ سحر دے
پھر ان شاہین بچوں کو بال و پر دے

خدایا آرزو میری یہی ہے
مرا نورِ بصیرت عام کر دے

رہ مہ در کعبہ اے پیر حرم اقبال را
ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

مُردوں کی طرف سے مایوسی ہے۔

بخاکِ ہند نوائے حیات بے اثر است
کہ مردہ زندہ نہ گردد ز نغمۂ داؤد

مایوس نہیں ہوئے۔

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

عشقِ رسول

اقبال کی تربیت جس اُستاد اور باپ کے زیر سایہ ہوئی وہ شیفتگان رسول سے تھے اور مومنانہ صلاحیت نے اقبال کے دل و دماغ کو حضور سرورِ کائنات کی محبت سے ایسا منور کردیا کہ باقی تمام چیزیں بحر ظلمات ہیں۔ محبت ہے تو رسول سے اُس کی اُمت سے اُس کی تعلیم سے مسلمان کے لئے ذریعہ نجات ہے تو رسول کی پیروی ہیں۔

یثرب سے محبت

تجھ میں راحت اُس شہنشاہ معظم کو ملی، جس کے دامن میں اماں اقوام عالم کو ملی
خشک لب انساں کو جس نے آبِ جاں پرور دیا عقل کو آزادِ زنجیرِ توہم کر دیا
جس نے عہدِ وصل باندھا مدتِ دوراں کے ساتھ جس نے پوری منصفی کی فطرتِ انساں کے ساتھ
نام لیوا جس کے شاہنشاہ عالم کے ہوئے جانشیں قیصر کے وارث مسندِ جم کے ہوئے

ملّت اسلامیہ سے محبّت

اگر یثرب سے محبّت ہے اس لئے کہ وطن رسول ہے تو مسلمانوں سے اس لئے محبّت ہے کہ وہ اُس رسول کی اُمت ہیں۔ ملّت اسلامیہ سے اُن کا خطاب۔

من شہیدِ تیغِ ابروے تو ام، خاکم و آسودۂ کوئے تو ام
من کہ ایں شب را چو ماہ آراستم، گردِ پائے ملّت بیضاستم

دنیا کی تمام رنگینیاں۔ رعنائیاں اور محبوبیاں محمّدؐ کی ذات سے ہیں۔

ہر کجا بینی جہانِ رنگ و بو آنکہ از خاکش بروید آرزو
یا ز نورِ مصطفےٰ او را بہا است یا ہنوز اندر تلاشِ مصطفےٰ ست

زندہ اور حقیقی مصطفوی جاننا چاہتا ہے پوچھتا ہے۔

از تو پرسم گرچہ پرسیدن خطا است سیرّ آں جوہر کہ نامش مصطفےٰ است

آدمی با جوہرِ اندر وجود ، آنکہ گاہے گاہے آید در وجود

حلاج جواب دیتا ہے۔

پیش او گیتی جبیں فرسودہ است ، خویش را خود عبدہٗ فرمودہ است
عبدہٗ از فہم تو بالا ترست ، زانکہ او ہم آدم و ہم جوہر است
کس ز سِرِ عبدہٗ آگاہ نیست ، عبدہٗ جز سِرِ الا اللہ نیست

حضور سرورِ کائنات کا رنامہ ملت اسلامیہ کی تخلیق۔

مصطفیٰ اندر حرا خلوت گزید ، مدتے جز خویشتن کس را ندید
نقشِ ما را در دلِ او ریختند ، ملتے از خلوتش انگیختند

دین مصطفیٰ کیا چیز ہے

ہست دینِ مصطفیٰ دینِ حیات ، شرع او تفسیرِ آئینِ حیات
گر زمینِ آسماں سازد ترا ، آنچہ حق می خواہد آں سازد ترا

رسولِ اکرم کا مقام اور آن کے احسانات۔ نعت کے بہترین نمونے۔

در جہاں آئینِ نو آغاز کرد ، مسندِ اقوام پیشیں در نورد
از کلیدِ دیں درِ دنیا کشاد ، ہمچو او بطنِ امِ گیتی نزاد
در نگاہش یکے بالا و پست ، با غلامِ خویش بر یک خواں نشست
در مصافے پیشِ آں گردوں سریر ، دخترِ سردارِ طے آمد اسیر
پائے در زنجیر و ہم بے پردہ بود ، گردن از شرم و حیا خم کردہ بود
دخترک را چوں نبی بے پردہ دید ، چادرِ خود پیشِ روے او کشید
ما ازاں خاتونِ طے عریاں تریم ، پیشِ اقوامِ جہاں بے چادریم
روزِ محشر اعتبارِ ماست او ، در جہاں ہم پردہ دارِ ماست او

لطف و قہرے او سراپا رحمتے — آں بیاراں ایں باعدا رحمتے
آنکہ براعدا در رحمت کشاد — آنکہ را پیغام لاتثریب داد
بوریا ممنون خواب راحتش — تاج کسریٰ زیر پائے امتش
در شبستانِ حرا خلوت گزید — قوم و آئین و حکومت آفرید
ماند شبہا چشم او محروم نوم — تا بہ تخت خسروی خوابید قوم
وقت ہیجا تیغ او آہن گداز — دیدہ او اشکبار اندر نماز

ہست معشوقے نہاں اندر دلت — چشم اگر داری بیا بنمایمت
عاشقانِ او ز خوباں خوب تر — خوشتر و زیباتر و محبوب تر
دل ز عشقِ او توانا می شود — خاک ہمدوشِ ثریا می شود
خاک نجد از فیض او چالاک شد — آمد اندر وجد و بر افلاک شد
در دلِ مسلم مقامِ مصطفےٰ است — آبروئے ما ز نامِ مصطفےٰ است

مسلمانوں کا تنزل آئین محمدؐ کے ترک کی وجہ سے ہے۔

شکوہ سنجِ سختیِ آئیں مشو — از حدودِ مصطفےٰ بیروں مرو
باطنِ ہر شے ز آئینِ قوی — تو چرا غافل ز ایں ساماں روی
باز اے آزادِ دستورِ قدیم — زینتِ پا کن ہماں زنجیر سیم
تا شعار مصطفےٰ از دست رفت — قوم را رمزِ بقا از دست رفت

مسلمان اپنی غیر اسلامی زندگی کی وجہ سے اس قابل بھی نہیں کہ رسول اکرمؐ پر درود بھیج سکے کیونکہ محمدؐ سے محبت اور عمل کی یہ کمزوریاں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

گرچہ دانا حالِ دل با کس نہ گفت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از تو دردِ خویش نتوانم نہفت
تا غلامم در غلامی زادہ ام ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ز آستانِ کعبہ دور افتادہ ام
چوں بنامِ مصطفٰے خوانم درود ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از خجالت آب می گردد وجود
عشق می گوید کہ اے محکومِ غیر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ سینہ تو از بتاں مانندِ دیر
تا نداری از محمدؐ رنگ و بو ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ از درودِ خود میالا نامِ او

جوانی کی ترنگ میں اقبال نے ایک مرتبہ ایک سائل کو پیٹا اور اُن کے والدِ بزرگوار کو یہ سخت ناگوار ہوا

بر لبش آہے جگر تابے رسید ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ درمیانِ سینۂ او دل تپید
کوکبے در چشمِ او گردید و ریخت ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ بر سرِ مژگاں دمے تابید و ریخت
ہمچوں آں مرغے کہ در فصلِ خزاں ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ لرزد از بادِ سحر در آشیاں
در تنم لرزید جانِ غافلم ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ رفت لیلائے شکیب از محملم،

نیک بخت باپ نے لڑکے سے کہا بیٹا وہ وقت یاد کرو جب میدان حشر میں ایک غریب فقیر مومنین کے گروہ میں کھڑا رسول اللہ سے فریاد کر رہا ہوگا۔

درمیانِ انجمن گردد بلند، ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ نالہ ہائے ایں گدائے دردمند
اے صراطت مشکل از بے مرکبی ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ من چہ گویم چوں مرا پرسد نبی
حق جوانے مسلمے با تو سپرد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ کو نصیبے از دبستانم نبرد
از تو ایں یک کار آساں ہم نشد ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ یعنی آں انبارِ گل آدم نشد
اندکے اندیش و یاد آر اے پسر ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ اجتماعِ اُمتِ خیر البشر
باز ایں ریشِ سفید من نگر، ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ لرزۂ بیم و امید من نگر،
بر پدر ایں جورِ نازیبا مکن ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ پیش مولا بندہ را رسوا مکن
غنچۂ از شاخسارِ مصطفٰے ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ ‏ گل شو از بادِ بہارِ مصطفٰے

از بہارش رنگ و بو باید گرفت　　بہرۂ از خُلقِ او باید گرفت

پیروی سنت کی دعوت

کاملِ بسطام در تقلید فرد　　اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد
عاشقی محکم شو از تقلید یار　　تا کمند تو شود گردوں شکار
اندکے اندر حرائے دل نشیں　　ترک خود کن سوئے حق خلوت گزیں
محکم از حق شو سوئے خود گام زن　　لات و عزائے ہوس را سر شکن
لشکرے پیدا کن از سلطانِ عشق　　جلوہ گر شو بر سر فارانِ عشق
تا خدائے کعبہ بنوازد ترا
شرح انی جاعل سازد ترا

اضطراب شوق ملاحظہ ہو

بہر دلیز تو از ہندوستان آوردہ ام　　سجدۂ شوقے کہ خوں گردید در سیمائے من
تیغ لا در پنجۂ ایں کافرے دیرینہ دہ　　باز بنگر در جہاں الائے من
از پسر بارگاہت یک جہاں وافر نصیب　　جلوہ داری دریغ از وادیِ سینائے من
با خدا در پردہ گویم با تو گویم آشکار　　یا رسول اللہ او پنہاں و تو پیدائے من

دردناک مناجات

مثنوی "پس چہ باید کرد اے اقوام شرق" میں خواب میں سر سید علیہ رحمتہ کے ایما سے اپنی بیماری سے رسول خدا کے دربار میں فریاد کی ہے

شہسوارا یک نفس در کش عنان　　حرف من آساں نیاید بر زباں
آرزو آید کہ ناید تا بہ لب　　می نہ گردد شوق محکوم ادب
آں بگوید لب کشا اے دردمند　　ایں بگوید چشم بکشا لب بہ بند

گرد تو گردد حریم کائنات — از تو خواہم یک نگاہ التفات
ذکر و فکر و علم و عرفانم توئی — کشتی و دریا و طوفانم توئی
آہوئے زار و زبون و ناتواں — کس بفتراکم نہ بست اندر جہاں

اے پناہ من حریم کوئے تو
من بامیدے رمیدم بوئے تو

علامہ اقبال کا گلا بیٹھ گیا اور بلند اور صاف آواز نہیں نکلتی نہ دیر تک گفتگو فرما سکتے ہیں۔ اس بیچارگی کو کس انداز فریاد میں پیش کیا ہے

آن نوا در سینہ پروردن کجا — وز دمے صد غنچہ وا کردن کجا
نغمۂ من در گلوئے من شکست — شعلۂ از سینہ ام بیروں نجست
در نفس سوز جگر باقی نہ ماند — لطفِ قرآنِ سحر باقی نہ ماند
نالہ کو می نگنجد در ضمیر — تا کجا در سینہ ام ماند اسیر

یک فضائے بے کراں می بایدش
وسعتِ نہ آسماں می بایدش

آہ زاں دودے کہ در جان و تن است — گوشۂ چشم تو داروئے من است
چوں بصیری از تو می خواہم کشود — تا من باز آیدآں روزے کہ بود (آمین)
مہر تو بر عاصیاں افزوں تر است — در خطا بخشی چوں مہر مادر است
با پرستارانِ شب دارم ستیز — باز روغن در چراغ من بریز (آمین)

گنہگار کا سرمایہ ایک محبت بھرا دل ہے۔

گرچہ کشت عمر من بے حاصل است — چیزکے دارم کہ نام او دل است
دارمش پوشیدہ از چشم جہاں — کز سُم شب دیز تو دارد نشاں

اے کہ دادی کُرد را سوزِ عرب | بندۂ خود را حضورِ خود طلب
بندۂ چوں لالہ داغے در جگر | دوستانش از غمِ او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے | تشنہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیاباں مثلِ چوبِ نیم سوز | کارواں بگذشت و من سوزم ہنوز
اندریں دشت و درے پہناورے | بو کہ آید کاروانے دیگرے

جاں ز مہجوری بنالد در بدن
نالۂ من وائے من اے وائے من

اقبال کی دعا اور آرزو

مسلمان کی حالت حضور رسالتماب میں عرض ہوتی ہے

اے ظہورِ تو شبابِ زندگی | جلوہ ات تعبیرِ خوابِ زندگی
اے زمیں از بارگاہت ارجمند | آسماں از بوسۂ بایت بلند
شش جہت روشن ز تابِ روئے تو | ترک و تاجیک و عرب ہندوئے تو
از تو بالا پایۂ ایں کائنات | فقرِ تو سرمایۂ ایں کائنات
در جہاں شمعِ حیات افروختی | بندگاں را خواجگی آموختی،
تا سرا افتاد بر رویت نظر | از اب وامِ گشتۂ محبوب تر
مسلم از سیرِ نبی بیگانہ شد | باز ایں بیت الحرم بتخانہ شد
ہمچو کافر از اجل ترسندۂ | سینہ اش فارغ ز قلبِ زندۂ
نقش از پیشِ طبیباں بردہ ام | در حضورِ مصطفیٰ آوردہ ام

اقبال عرض کرتا ہے کہ اگر اُس نے اپنی قوت تعلیم اسلام کی ضرورت و محبوبیت ظاہر کرنے کے علاوہ کسی طرح پر ظاہر کی ہو تو وہ بڑی سے بڑی سزا کے لائق ہے۔

گردلم آئینہ بے جوہر است
دربحرفم غیر قرآں مضمر است

اے فروغت صبح اعصار و دہور
چشم تو بینندۂ ما فی الصدور

پردۂ ناموس فکرم چاک کن
ایں خیاباں را زخارم پاک کن

تنگ کن رختِ حیات اندر برم
اہل ملت را نگہدار از شرم

سبز کشتِ نابسامانم مکن
بہرہ گیر از ابرِ نیسانم مکن،

خشک گرداں بادہ در انگورِ من
زہر ریز اندر مئے کافورِ من،

روز محشر خوار و رسوا کن مرا
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا

اپنی مسلمان دوستی کا واسطہ دے کر توفیقِ عمل کی دعا چاہتے ہیں

گر دُرِ اسرار قرآں سفتہ ام
با مسلماناں اگر حق گفتہ ام

اے کہ از احسانِ تو ناکس کس است
یک دعایت مزد گفتارم بس است

عرض کن پیشِ خدائے عزّ و جل
عشقِ من گردد ہم آغوشِ عمل،

دولتِ جانِ حزیں بخشیدۂ
بہرۂ از علمِ دیں بخشیدۂ

در عمل پایندہ تر گرداں مرا
آب نیسانم گہر گرداں مرا

حقیقی آرزو۔

رختِ جاں تا در جہاں آوردہ ام
آرزوئے دیگرے پروردہ ام

ہمچو دل در سینہ ام آسودہ است
محرم از صبحِ حیاتم بودہ است

از پدر تا نامِ تو آموختم،
آتشِ ایں آرزو افروختم

تا فلک دیرینہ تر سازد مرا
در قمارِ زندگی بازد مرا،

آرزوے من جواں ترمی شود | ایں کہن صہبا گراں ترمی شود
ایں تمنا زیر خاکم گوہر است | در شبم تابِ ہمیں یک اختر است
مدتے بالالہ رویاں ساختم | عشق با مرغولہ مویاں باختم
بادہ ہا با ماہ سیمایاں زدم | بر چراغِ عافیت داماں زدم
برقہا رقصید گردِ حاصلم | رہزناں بردند کالائے دلم
ایں شراب از شیشۂ جانم نہ ریخت | ایں زرِ سارا ز دامانم نہ ریخت
ایں تمنا در دلم خوابیدہ ماند | در صدف مثلِ گہر پوشیدہ ماند
آخر از پیمانۂ چشمم چکید | در ضمیرِ من نواہا آفرید

انداز بیان ملاحظہ ہو ایک مصرعہ کتنے ہی دواوین کو شرماتا ہے۔ ایک خطاکار غلام کس انداز سے اظہار آرزو کی خواہش کرتا ہے

اے زیادِ غیر تو جانم تہی | بر لبش آرم اگر فرماں دہی
زندگی از عمل ساماں نہ بود | پس مرا ایں آرزو شایاں نہ بود
شرم از اظہار او آید مرا | شفقتِ تو جرات افزاید مرا
ہست شانِ رحمتت گیتی نواز | آرزو دارم کہ میرم در حجاز
مسلمے از ماسوا بیگانہ | تا کجا زناری بتخانہ
حیف چوں او سرآید روزگار | پیکرش را دیر گیرد در کنار
از درت خیزد اگر اجزائے من | وائے امروزم خوشا فردائے من
فرخا شہرے کہ تو بودی در آں | اے خنک خاکے کہ آسودی در آں
کو کبم را دیدۂ بیدار بخش | مرقدے در سایۂ دیوار بخش
تا بیاساید دلِ بیتابِ من | بستگی پیدا کند سیمابِ من

با فلک گویم کہ آرامم نگر
دیدۂ آغاز انجامم نگر

ملّت اسلامیہ کی زندگی عشق رسولؐ کی تازگی سے ہے۔

ہر کہ عشقِ مصطفیٰؐ سامانِ اوست	بحر و بر در گوشۂ داماں اوست
سوز صدیقؓ و علیؓ از حق طلب	ذرۂ عشق نبیؐ از حق طلب
زانکہ ملّت را حیات از عشق اوست	برگ و سازِ کائنات از عشق اوست
جلوۂ بے پردۂ او وا نمود	جوہر پنہاں کہ بود اندر وجود

روح را جز عشق او آرام نیست
عشق او روزیست کو را شام نیست

بہار نامۂ ہندی

شیخ عبدالحق صاحب متعلم مسلم یونیورسٹی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ الکریم صلی اللہ علیہ وسلم وآلہ واصحابہ اجمعین

خیمہ زن ہے چمن میں ابرِ بہار (۱) زندگی کے ہیں ہر طرف آثار

کچھ برستی ہے اس طرح سے پھوار خلد میں جیسے ریزشِ انوار

یاسمن، جوہی، نسترن، بیلا کارواں کارواں قطار قطار

اک طرف خندۂ گلِ رنگین اک طرف آہِ عندلیبِ زار

اک طرف ہے نسیم عنبر بیز اک طرف ہے چنار آتش بار

اک طرف اک جہانِ تنہائی (۲) ئے اک جہانِ بوس و کنار

اک طرف سنبل اک طرف لالہ اک طرف سرو اک طرف گلنار

اک طرف تختۂ گلاب کا رنگ اک طرف نسترن کے نقش و نگار

اک طرف آفتاب، نور افشاں اور اک سمت، ابرِ گوہر بار

اک طرف ہے سکونِ زیرِ درخت اک طرف ٹہنیوں پہ چیخ پکار

نغمہ سازِ ازل نے چھیڑے ہیں اک طرف دیپک اک طرف گندھار

دل میں سبزے کے حسرتِ پابوس چشمِ نرگس کو حسرتِ دیدار

نغمہ زن قمریِ ترانہ سنج نالہ کش عندلیبِ سینہ فگار

آبِ جو نغمہ سنجِ موسمِ گل اور ہوا مدح گوئے فصلِ بہار

موج کی موج سے ہم آغوشی آبشاروں کے لب پہ شور پکار

جملہ تصویرِ تمکنت دریا جملہ آئینِ نازِ جوئبار

اک طرف وہ روانیٔ دریا | اک طرف وہ خموشیٔ کہسار
نظر آتے ہیں دونوں دوش بدوش | اک طرف ثابت اک طرف سیار
خوب نظرت بنائی دونوں کی | اک مشتاق دوسرا بیزار
نظر آتی ہے یوں افق پہ شفق | سرخ جیسے ہوں یار کے رخسار
یوں نسیم سحر کی آمد ہے | جیسے کوئی حسین سبک رفتار
اک قیامت ہے آب جو کے قریب | ایک ہنگامہ ہے سر گلزار
وہ پپیہے کا شور، وہ پی پی | آم کے بن میں کوئلوں کی پکار
آج قرطاس دہر رنگیں ہے | دست قدرت ہے خوب نکتہ نگار
اس چمن کی بہار لاثانی | باغ فردوس اس کا باجگزار
آج صوفی ہے مست عیش و نشاط | شیخ ہے آج رند بادہ خوار
کاش کہدے پکار کر کوئی | ہے کھلا آج باب استغفار
کوئی دیکھے چمن کی دنیا کو | فاش قدرت نے کر دیے اسرار
آج ہر ابر، ابر نیساں ہے | آج ہر قطرہ ہے دُرِ شہوار
آج ہر نخل خشک ہے شاداب | آج ہر شاخسار ہے گلبار
ہر قلم، آج شاخ غنچہ ریز | ہر کشش آج ہے خط گلزار
کون سمجھے مطالب نازک | ہے چمن آج، مخزن الاسرار

آہ بے یار آئی فصل بہار
کیجیے کس پہ اپنی جان نثار

(۲)

گر کہوں بے نقاب اپنا راز | فقہا، دینگے فتوئ تکفیر

گر گردوں میں موافقت اپنی　　ہوں مخالف میرے جوان و پیر
عشق کی گرمیاں، معاذ اللہ　　ہے لب برہمن پہ بھی تکبیر
ذہن میں کس کے آئے میری بات　　کون سمجھے نوشتۂ تقدیر
حسن اپنا عیار رکھتا ہے　　عشق کرتا ہے دو جہاں تسخیر
حسن کی خود نمائیوں پہ نہ جا　　عشق کی بارگاہ میں ہی حقیر
حسن بھی ہے اگرچہ لاثانی　　عشق کی بھی کوئی نہیں ہے نظیر
حسن کو بھی ضرورتِ تشریح　　عشق کو بھی ہے حاجتِ تفسیر
حسن کی ہیں کرامتیں بیحد　　عشق کے بھی ہیں معجزاتِ کثیر
حسن بھی عشق کا ہے دامن کش　　عشق بھی حسن کا ہے دامنگیر
حسن میں بھی ہے اک جہانِ کشش　　عشق میں بھی ہے جذبِ عالمگیر
حسن کا ذرہ ذرہ ضو افشاں　　عشق کا ذرہ ذرہ، مہرِ منیر
حسن کی ہر ادا میں آگ نہاں　　عشق کی ہر روش ہے آتشگیر
حسن بھی رو کشِ بہارِ عجم　　عشق بھی رشکِ خطۂ کشمیر

یعنی میرا نہیں جواب کوئی
یعنی تیری نہیں ہے کوئی نظیر

(۳)

فکرِ دنیا، و فکرِ ما فیہا　　کچھ نہیں جز دروغِ راست نما
اک حکایت جنید و بسطامی　　اک کہانی سکندر و دارا
یہ فقیری ہے اک فریبِ خرد　　یہ امارت ہی نفس کا دھوکا
آسمان و زمین مشتِ غبار　　تودۂ خاک گلشن و صحرا

کل وہی ہوگا خستہ پیرِ ضعیف — آج جو ہے جوانِ بت رعنا
کل وہی ننگِ حسن و رعنائی — آج وہ رشکِ کشمر و یغما
کل کفن پوش بے حس و حرکت — زیب تن آج اطلس و دیبا
چرخ کی یہ فریب کاری دیکھ — آج امروز اور کل فردا
کل جسے فرشِ خاک ہوگا نصیب — آج وہ تخت پر ہے جلوہ نما
اک حکایت ہے عقدِ ماہی جہاں — اک فسانہ ہے فکرِ ما فیہا
جن کے دل میں ہے گرمیٔ الفت — ان کو سود و زیاں کا کیا کھٹکا

تو میرا کیا بنے گا الفت میں
درحقیقت نہیں ہے تو اپنا

(۴)

تو حقیقت شناس کیا ہوگا — تیری آنکھوں پہ ہے نظر کا حجاب
اسکو گردش ہے اسکو وقتِ فنا — ایک ہیں یہ حباب اور گرداب
دل ہے ناواقفِ سرور و سرود — بزمِ ماتم ہے تیری بزمِ رباب
تو تہی دست، وہ تہی ایماں — تجھ سے بڑھکر فرنگ خانہ خراب
تیرا ہر ذرہ خوگرِ تجدید — اس کی ہر شان جلوہ پا بہ رکاب
گر بڑھی مفلسی تو شیخِ حرم — بھول جائیگا سیم و زر کا نصاب
بارِ افلاس کس سے اٹھتا ہے — خود بخود خم ہیں آج کل محراب
دیکھتا ہوں کہ ہوتے جاتے ہیں — رہنِ افرنگ منبر و محراب
اک تجارت ہے تیری ملائی، — نسخۂ کیمیا خدا کی کتاب
بے خبر ہے مری نواؤں سے — ابھی مغرب ہے مستِ چنگ و رباب

ننگِ مشرق ہو تیری پیری
وقفِ مغرب ہے تیرا عہدِ شباب

(۵)

کیا بتاؤں رموزِ فاروقیؓ — تونے سیکھی نہیں ہے کرّاری
کوئی عیسای عرب سے کہدے — زخمِ تہذیب ہے بہت کاری
ھند کے انقلابِ پیہم سے — ابھی غافل ہیں ترک و تاتاری

قطعہ

دن بدن مَے فروشِ مغرب کی — ہوئی جاتی ہے پختہ عیاری
آہ، یہ ہند، رندِ سادہ لوح — ہے فزوں اس کا شوقِ میخواری
ہے یہ محتاجِ مَے، وہ بادہ فروش — ہے یہی وجہ گرم بازاری
ہند پر ہے جنوں کا یورش — کون کہتا ہے اسکو ہشیاری
جس سے بیدار ہوں نگاہ و دل — درحقیقت وہی ہے بیداری
تیری مژگاں بھی تجھ سی تر نہ ہوئی — پھر بھی سیلِ سرشک ہے جاری
نہ سُنا، حُریّت کا افسانہ — ہے یہ گفت و شنید بازاری

حشر کے واسطے کفایت ہے
ایک آزاد کی گرفتاری

(۶)

سن اے ناشناسِ بحرِ حیات — کہہ رہا ہوں میں تجھ سے راز کی بات
آہ، تو ہے سکون کا طالب — ہے تگ و دو کا نام اصلِ حیات
گر سمجھ جائے تو ممات کے راز — پھر تری موت بھی ہے عینِ حیات

روشنی کا طلسمِ غیب و حضور — اک فریبِ نظر ہیں دن اور رات
گر نظر پختہ ہو محبت میں — چاک ہو جائے خود قبائے صفات
غور سے دیکھ انقلابِ جہاں — ابرِ قدرت کے ہیں یہی رشحات
حشر کا دن اسی کو کہتے ہیں — تجھ پہ کھل جائے جب طلسمِ حیات
کلمۂ لا الٰہ الا اللہ — اپنی ہی نفی اپنی ہی اثبات
تنکے ہیں آشیاں میں بجلی کے — کتنے نازک ہیں میرے احساسات

(۷)

گر عنایت مجھے شعور و تمیز — گرچہ نعمت کا ہو چکا اتمام
مجھ کو آزاد کیا کیا تو نے — تیلیاں ہیں قفس کی صبح و شام
سجدۂ شوق کیا ادا ہوگا — آہ، پابندیٔ قعود و قیام
گر عنایت مجھے وہ ذوقِ سفر — فکرِ منزل نہ جس میں عشقِ مقام
تجھ سے ہی میری بندگی قائم — مجھ سے تیری خدائی کا ہے نظام

یعنی میں بندۂ محبت ہوں
خویشتن ساز، خود نگر، خود کام

(۸)

مسئلہ عصر و اثراتِ آں

بندۂ عصر کاش سمجھے تو — عصرِ حاضر میں نکتۂ اعصار
عصر کیا ہے تجھے نہیں معلوم — یہ نہیں از قبیلِ نور و نار
حرکت اور عصر[1] ایک نہیں — اُس میں تقسیم اِس میں ہے تکرار

---

[1] زینو کا نظریہ اسلئے درست نہیں کہ اس نے حرکت کو محلات پر منقسم کیا ہے اور اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تیر اپنی حالتِ پرواز میں متحرک نہیں ہے بوجہ کہ وہ اپنے ہر محل پر ساکن اور غیر متحرک ہے۔

عصر[1] اور بُعد متصل کیا خوب! — یہ نہیں ہے تسلسلِ افکار

سلسلہ[2] عصر کا ہے وجہِ علل — یہ بھی اک بے سمجھ کی ہے گفتار

یہ حکیمِ[3] یہود نکتہ شناس — گرم ہے جس کا آج کل بازار

جانتا ہی نہیں کہ عصر ہے کیا — گو اضافت کے ہیں صحیح اسرار

ہے نظر اس کی شکلِ اشیاء پر — اس کی بنیاد ظاہری آثار

ماہیت سے نہیں ہے بحث اسے — اصلیت سے نہیں اُسے سروکار

متفق برگساں سے گرچہ نہیں — پھر بھی ہے کشتۂ خزان و بہار

غلط اندیش ہے یہ مردِ ذکی — اُس کا دل خفتہ، عقل ہے بیدار

ناشناسِ سپہگری ہے تو — عصرِ حاضر ہے تیغ جوہر دار

منحصر عصر ہی پہ ہیں اقوام — امتوں کا ہے عصر ہی پہ مدار

متبدل ہیں عصر سے بے جان — متغیر ہیں عصر سے جاندار

عصر ہی کے کرشمے ہیں سارے — کوئی آسودہ حال کوئی خوار

رند کے سر پہ عصر سایہ فگن — شیخ کے سر عمامہ و دستار

عصر[4] کے دم سے گردشِ افلاک — عصر کے جز نہیں ہیں لیل و نہار

---

[1] کینٹر کی تحقیقات یہ ہیں کہ عصر اور بُعد دونوں دوش بدوش رواں ہیں۔

[2] کانٹ اپنے نظریہ کے مطابق اسباب و علل کو تسلسلِ وقت کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

[3] حکیم یہود سے مراد اینسٹائن ہے جس کے نظریۂ اضافت سے وقت کی اصلیت پر حکم نہیں لگایا جا سکتا۔

[4] دیکھو ڈاکٹر سر محمد اقبال کی کتاب تشکیل سیاتِ جدید، تقریر نمبر ۲، اور اینسٹائن کے نظریہ پر تنقید۔

پیچ و خم ہے مگر شکستہ نہیں ہے مسلسل مثالِ جوئبار
یہ پہاڑوں کو کاٹ دیتا ہے تیز تلوار سے ہے اس کی دھار
سلطنت ہو کہ دورِ جمہوری وہ قدیم اور یہ جدید آثار
اس سے بچ کر نکل نہیں سکتا کوئی ثابت ہو یا کوئی سیّار
یاں تیرا عصر رنگِ طبعیات واں فلزّات سے چمن میں بہار
اک یہاں عصر قاتل و دشمن اک وہاں عصر دلبر و دلدار
اک یہاں عصر سلطنت گرداں اک وہاں عصر ہے عروس نگار

یعنی مشرق ہے عصر سے مرغوب
اور مغرب کا عصر باجگذار

ایک مدت سے دیکھتا ہوں کہ تھا عصر سے غرب برسرِ پیکار
افقِ عصر رک گیا لیکن ہے ابھی کچھ افق پہ گرد و غبار
آج مغرب میں سب عیاں ہیں جسقدر ہیں زوال کے آثار
مژدہ ہندوستان والوں کو بسترِ مرگ پر ہے ساہوکار
مژدہ مزدور کو کہ چھایا ہے کشتِ ویراں پہ ابرِ گوہربار
باغِ عالم بدلنے والا ہے دیکھ یہ انقلاب کے آثار

خیمہ زن ہے چمن میں ابرِ بہار
زندگی کے ہیں ہر طرف آثار

لہ عصر کے وہ اثرات جو حیاتِ انسانی کے لئے مضر ہیں اُن سے بچنے کے لئے ایمان کا ہونا لازمی شے ہے قرآن پاک میں اسی طرف اشارہ ہے:۔ والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین امنوا الخ ۔

اقبال کا فلسفۂ جہاد

از ظفر احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے ریلیگ لیکچرار فلاسفی
مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

جب شاعر مشرق کا "بال جبرئیل" پہلی بار مشتاق نظروں کے سامنے آیا۔ اس وقت بعض کم نظر ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی کم مائگی یا تعصّب کی بنا پر مشرق کے اس درخشندہ آفتاب پر خاک ڈالنے کی کوشش شروع کر دی۔ اگرچہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ

لیکن علامہ اقبال سے مجھے جو عقیدت اور ان کے کلام سے جو شغف رہا ہے اس کی بنا پر میرا دل ان اعتراضوں سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میرے ان تاثرات نے ایک نظم کی صورت اختیار کر لی۔ چونکہ اس نظم میں میں نے اپنے خیالات کے مطابق علامۂ موصوف کے فلسفہ کی توجیہ اور تفسیر کی کوشش کی تھی اسلئے میں نے مناسب سمجھا کہ اپنے خیالات کو بہ نظر اصلاح اقبال کی خدمت میں مؤدبانہ پیش کر دوں۔ علامہ موصوف نے میری نظم کے جواب میں ازراہ کرم ایک نہایت واضح جامع اور بلیغ گرامی نامہ ارسال فرمایا جسمیں اُنھوں نے اپنے سارے فلسفہ کا عطر اور مخالفین کے اعتراضات اور شکوک کا مکمل جواب پیش کر دیا ہے۔ چونکہ نظم اور اس نامۂ گرامی کا عنوان بالا سے بہت گہرا تعلق ہے اسلئے اپنے مضمون کی طرف آنے سے پہلے اس نظم اور خط کو ناظرین کے سامنے پیش کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔

نظم

(اقبال کے معترضین کے جواب میں)

اک دوست کہ میخانۂ مغرب کے ہیں میخوار   کہنے لگے "اقبال کے ہو تم بھی پرستار؟
"اقبال کہ اک فلسفی خانہ نشیں ہیں   رفتار زمانہ سے خبردار نہیں ہیں"
"اشعار میں ہرچند کہ ہے جدّت افکار   ہر لفظ ہے اک آئینۂ شوخیِ گفتار

ہر چند کہ ہر درد کی لذت سے بھرا دل — لیکن میں نہیں ان کے خیالات کا قائل
اس دورِ ترقی میں بھی ہیں جنگ کے حامی — سچ پوچھو تو یہ اُن کے تخیل کی ہے خامی
دیتے ہیں بہت زور وہ تعلیمِ خودی پر — مطلب یہ ہے نیجا و مسولینی و ہٹلر
لیکن ہے غضب رکھتے ہیں اسلام پہ تہمت — اس پردہ میں سکھلاتے ہیں خونریزی و غارت
لیکن اگر اقبال کی تعلیم کو مانو — چنگیز و ہلاکو کو سیہ کار نہ جانو
حجاج کو الزام نہ دو ظلم و جفا کا — دو عتبہ و بوجہل کو رتبہ شہدا کا
بیشک تھی خودی انکی بہت ارفع و اعلیٰ — عالم کو کیا ان کی خودی نے تہ و بالا
اقبال تو خیر اپنے تعصب سے ہیں ناچار — اسلام بھی کیا ایسی خودی کا ہے طرفدار!
تا دیر رہی یونہی زباں ان کی گہر ریز — لیکن ہوئی جب ختم یہ تقریر دلاویز
میں نے کہا "گر خاطرِ نازک پہ نہ ہو بار — اک تلخ حقیقت کا ہے کرنا مجھے اظہار
سمجھا ہی نہیں آپ نے اقبال کی لے کو — ہیں جام پہ نظریں ابھی چکھا نہیں مے کو
اقبال جو کہتے ہیں خودی ہو تری عالی — مطلب یہ ہے تلوار نہ جوہر سے ہو خالی
اشعار میں آتی ہے جو شاہیں کی حکایت — ہے از رہِ تمثیل نہ از راہِ حقیقت
مطلب یہ ہے سرگرمِ عمل تیری خودی ہو — لیکن یہ ضروری نہیں مسلک بھی وہی ہو
چنگیز و ہلاکو میں بھی اک جوشِ خودی تھا — گم کردہ منزل تھا مگر قافلہ ان کا

افسوس کہ جس قوم کا مقصد بھی ہو عالی
ہو اسکی خودی مردہ عمل جوش سے خالی

(ظفر)

(علامہ اقبال کے اس گرامی نامہ کی نقل جو آپ نے متذکرہ بالا نظم کے جواب میں ارسال فرمایا)

لاہور ۱۲ دسمبر ۱۹۳۶ء .... جناب من معترض[1] ....

.... قرآن کریم کی تعلیم سے بے بہرہ ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسلامی تصوف
میں مسئلہ خودی کی تاریخ اور نیز میری تحریروں سے ناواقف محض ہے۔ موخر الذکر صورت میں میں
اسے معذور جانتا ہوں۔ آخر اس غلامی کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس کونسا ذریعہ ہے جس سے
وہ اپنی آیندہ نسلوں کو اسلامی تصورات کے بننے اور بگڑنے کی تاریخ سے آگاہ کرسکے۔ غلام قوم
مادیات کو روحانیات پر مقدم سمجھنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اور جب انسان میں قوئے غلامی راسخ
ہو جاتی ہے تو ہر ایسی تعلیم سے بیزاری کے بہانے تلاش کرتی ہے جس کا مقصد قوت نفس اور
روح انسانی کا ترفع ہو۔

۲۔ اعتراض کا جواب آسان ہے۔ دین اسلام جو ہر مسلمان کے عقیدہ کی رو سے ہر شے
پر مقدم ہے نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں کو فنا نہیں کرتا بلکہ ان کے عمل کے لئے حدود
معین کرتا ہے۔ ان حدود کے متعین کرنے کا نام اصطلاح اسلام میں شریعت یا قانون الٰہی ہے
خودی خواہ مسولینی کی ہو خواہ ہٹلر کی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے تو مسلمان ہو جاتی ہے۔ مسولینی
نے جشہ کو محض جوع الارض کی تسکین کے لئے پامال کیا مسلمانوں نے اپنے عروج کے زمانہ میں حبشہ
کی آزادی کو محفوظ رکھا۔ فرق اس قدر ہے کہ پہلی صورت میں خودی کسی قانون کی پابند نہیں دوسری
صورت میں قانون الٰہی اور اخلاق کی پابند ہے۔ بہر حال حدود خودی کے تعین کا نام شریعت ہے۔ اور شریعت
اپنے قلب کی گہرائیوں میں محسوس کرنے کا نام طریقت ہے۔ جب احکام الٰہی خودی میں اس حد تک
سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال وعواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا
مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیۂ اسلام نے فنا کہا ہے۔ بعض نے اسی کا
نام بقا رکھا ہے لیکن ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثر نے مسئلہ فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ مت
کے زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ محض ہے۔ میرے

---

[1] ایک فقرہ حذف کردیا گیا ہے

عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے بھی زیادہ خطرناک تھی اور ایک معنی میں میری تمام تحریریں اس تفسیر کے خلاف ایک قسم کی بغاوت ہیں۔

۳۔ معترض کا یہ کہنا کہ اقبال اس دور ترقی میں جنگ کا حامی ہے غلط ہے میں جنگ کا حامی نہیں ہوں نہ کوئی مسلمان شریعت کے حدود معینہ کے ہوتے ہوئے اس کا حامی ہو سکتا ہے۔ قرآن کی تعلیم کی رو سے جہاد یا جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ۔ پہلی صورت میں یعنی اس صورت میں جبکہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے مسلمان کو تلوار اٹھانے کی اجازت ہے (نہ حکم) دوسری صورت جس میں جہاد کا حکم ہے ۴۹:۹[1] میں بیان ہوئی ہے۔ ان آیات کو غور سے پڑھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ چیز جس کو سیموئیل ہور جمعیت اقوام کے اجلاس میں Collective security کہتا ہے قرآن نے اس کا اصول کس سادگی اور فصاحت سے بیان کیا ہے اگر گذشتہ زمانہ کے مسلمان مدبرین اور سیاسیتین قرآن پر تدبر کرتے تو اسلامی دنیا میں جمعیت اقوام کو بنے ہوئے آج کئی صدیاں گذر گئی ہوتیں۔ جمعیت اقوام جو زمانۂ حال میں بنائی گئی ہے اس کی تاریخ بھی یہی ظاہر کرتی ہے کہ جب تک اقوام کی خودی قانون الٰہی کی پابند نہ ہو امن عالم کی کوئی سبیل نہیں نکل سکتی۔ جنگ کی مذکورہ بالا دو صورتوں کے سوائے میں اور کسی جنگ کو نہیں جانتا۔ جوع الارض کی تسکین کے لئے جنگ کرنا دین اسلام میں حرام ہے۔ علیٰ ہذا القیاس دین کی اشاعت کے لئے تلوار اٹھانا بھی حرام ہے۔

۴۔ شاہین کی تشبیہ محض شاعرانہ تشبیہ نہیں ہے۔ اس جانور میں اسلامی فقر کے تمام خصوصیات پائے جاتے ہیں (i) خود دار و غیرت مند ہے کہ اور کے ہاتھ کا مارا ہوا شکار نہیں کھاتا (ii) بے تعلق ہے کہ آشیانہ نہیں بناتا (iii) بلند پرواز ہے (iv) خلوت پسند ہے (v) تیز نگاہ ہے

---

(۱) سورہ الحجرات کی نویں آیت

آپ کے خط کا جواب حقیقت میں طویل ہے لیکن افسوس کہ میں طویل خط لکھنا تو درکنار معمولی خط کتابت سے بھی قاصر ہوں۔ محمد اقبال

متذکرہ بالا خط سے حسب ذیل اہم نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں۔

اقبال نفس انسانی اور اس کی مرکزی قوتوں ہی کو خودی کے نام سے موسوم کرتے ہیں خودی کی تین حالتیں ہو سکتی ہیں ایک تو تعطل اور جمود کی حالت جس میں خودی کی عملی قوتیں مردہ ہوں دوسرے جوش عمل کی وہ حالت جس میں خودی کسی ضابطہ یا قانون کی پابند نہ ہو۔ تیسرے وہ حالت جس میں خودی کا عمل اور اس کی قوتیں قانون الٰہی و اخلاق کی پابند ہوں۔

حقیقتاً تیسری صورت ہی میں خودی کی اصل رفعت مضمر ہے۔ اور یہی اسلام کا منشاہے۔ شریعت اسلام کا بھی یہی مقصد ہے کہ انسانوں کی خودی قانون الٰہی کی پابند ہو جائے۔ خودی کی انتہائی رفعت اس میں ہے کہ اس کا ہر فعل ہر عمل رضائے الٰہی کے لئے ہو۔ (نہ کہ عمل کو ترک کرنے اور زندگی کی جدوجہد سے منھ موڑنے میں جیسا کہ غلطی سے ہندوستان اور ایران کے اکثر متصوفین نے سمجھا)۔ اقبال کا سارا فلسفۂ خودی اور تمام تعلیم عمل اسی غلط نظریہ کے خلاف جو مسلمانوں کی تباہی و پستی کا اصل ذمہ دار ہے ایک صدائے احتجاج ہے۔ وہ اسلام کی صحیح روح سے مسلمانوں کو آگاہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ بے عملی کو خودی کی بقا کے منافی سمجھتے ہیں لیکن بے قید جوش عمل کو بھی خودی کی ارتقا میں سد راہ جانتے ہیں۔

ان نتائج کی روشنی میں اقبال کی تعلیم جہاد کو دیکھئے تو صاف معلوم ہو جائیگا کہ وہ ظلم یا ناحق کوشی کے لئے جنگ کو کبھی جائز نہیں سمجھتے۔ وہ خودی کو جہاں جوش عمل کی دعوت دیتے ہیں یا بہ الفاظ دیگر جہاد کی تلقین کرتے ہیں وہاں یہ بھی بتا دیتے ہیں کہ یہ جوش عمل یہ جذبۂ جہاد خود غرضانہ مصلحتوں اور ہوا و ہوس کی اغراض کے لئے ہرگز نہ ہو۔ جہاد کا مقصد صرف رضائے الٰہی ہونا چاہیئے یا حق و انصاف کی حمایت اور انسانی ہمدردی۔ چنانچہ اپنے اس یادگار خط میں آگے چل کر وہ وضاحت سے فرماتے ہیں کہ "قرآن مجید

کی روسے جنگ کی صرف دو صورتیں ہیں۔ محافظانہ اور مصلحانہ؛ اصول دونوں صورتوں میں ایک ہی ہے۔ خواہ مسلمانوں پر ظلم کیا جائے اور ان کو گھروں سے نکالا جائے یا ایک گروہ دوسرے گروہ پر ظلم اور زیادتی کر رہا ہو دونوں صورتوں میں جہاد حق و انصاف کی حمایت یا بہ الفاظ دیگر رضائے الٰہی کی خاطر ہی کیا جائیگا۔

یہ تھا جہاد کا بنیادی اصول اور اقبال کے پیغام کا مرکزی خیال جو علامۂ موصوف کے مندرجہ بالا گرامی نامے سے واضح ہو جاتا ہے۔ اس بنیادی اصول پر کس طرح وہ اپنی فلسفیانہ شاعری کی عظیم الشان عمارت کھڑی کر دیتے ہیں کس طرح وہ اس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں غرض اس سارے اجمال کی تفصیل ان کے کلام پر ایک غائر نگاہ ڈالنے سے ہو سکتی ہے۔

پہلے مسئلہ خودی ہی کو لیجئے جس پر اقبال کی تعلیم جہاد کی ساری بنیاد ہے۔ اقبال ہمیں خودی یا نفس انسانی کی اہمیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ

خودی کے نور سے روشن ہیں اُمتوں کے چراغ — خودی کے ساز میں ہے عمرِ جاوداں کا سراغ
حیات کیا ہے اسی کا سرور و سوز و ثبات — تری خودی سے ہے روشن ترا حریم وجود

ع "وجود کیا ہے فقط جوہر خودی کی نمود"

اگرچہ وجود حیات رونق حیات وغیرہ سب خودی ہی کے مظاہر ہیں لیکن خودی ان مظاہر سے مختلف بھی ہے اور ان مظاہر میں جلوہ نما بھی۔ مختصر یہ ہے کہ خودی ایک غیر مادی غیر محدود اور بے چگوں حقیقت ہے۔ خودی کی اصل اس مادّی دنیا سے نہیں۔ یہ جہاں آب و گل خودی کی امتحان گاہ ہے یا یوں سمجھئے کہ خودی کے سفر ارتقا میں سر راہ ہے خودی کے جوہر نمایاں ہونے کے لئے اور منازل ارتقا طے کرنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خودی زماں و مکان کی زنجیروں سے مقید اور علائق دنیاوی کی پابند نہ ہو بلکہ رضائے الٰہی پر چل کر جہاں آب و گل کو اپنا مسخر کرے۔ خودی کی ارتقا اس جہاں تک محدود نہیں بلکہ "ستاروں کے آگے جہاں اور بھی ہیں۔
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں"

غرض مختلف منزلوں سے گذرنا اور مختلف جہانوں کو اپنے حسن کردار سے فتح کرنا ہے۔ اب اس نظریہ کی تفسیر ذرا اقبال کی زبان سے سنئے۔

خودی کیا ہے رازِ درونِ حیات — خودی کیا ہے بیداریٔ کائنات
خودی جلوہ بدمست و خلوت پسند — سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تابناک — من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
من و تو سے ہے انجمن آفریں — مگر عینِ محفل میں خلوت نشیں
یہ وحدت ہے کثرت میں ہر دم اسیر — مگر ہر کہیں بے چگوں بے نظیر
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے — نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے
خودی کا نشیمن ترے دل میں ہے — فلک جس طرح آنکھ کے تل میں ہے
یہ عالم یہ ہنگامۂ رنگ و صوت — یہ عالم کہ ہے زیرِ فرمانِ موت
خودی کی یہ ہے منزلِ اولیں — مسافر یہ تیرا نشیمن نہیں
تری آگ اس خاکداں سے نہیں — جہاں تجھ سے ہے تو جہاں سے نہیں
بڑھے جا یہ کوہِ گراں توڑ کر، — طلسمِ زمان و مکاں توڑ کر
خودی شیرِ مولیٰ جہاں اسکا صید — زمیں اس کی صید آسماں اس کا صید
جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود — کہ خالی نہیں ہے ضمیرِ وجود
ہر اک منتظر تیری یلغار کا — تری شوخیٔ فکر و کردار کا،
یہ ہے مقصدِ گردشِ روزگار — کہ تیری خودی تجھ پہ ہو آشکار

(ساقی نامہ ۔ بالِ جبرئیل)

یہ تھا مختصراً اقبال کا فلسفۂ خودی۔ اسی فلسفہ سے وہ مسئلہ جہاد اخذ کرتے ہیں۔ خودی کے جوشِ کردار ہی کا دوسرا نام جہاد ہے۔ چنانچہ جہاد کے متعلق ہمیں اقبال کے یہاں بہ کثرت اشعار ملتے ہیں۔

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو — ہو جس کی رگ و پے میں فقط مستی کردار

شکایت ہے مجھے یارب خداوندانِ مکتب سے — سبق شاہیں بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

دفعتاً جس سے بدل جاتی ہے تقدیر امم — ہے وہ قوت کہ حریف اسکی نہیں عقل سلیم

ہر زمانے میں دگرگوں ہے طبیعت اسکی — کبھی شمشیر محمدؐ ہے کبھی چوب کلیم

ایک جگہ رومیؒ کی زبان سے کہلواتے ہیں۔

مصلحت در دین ما جنگ و شکوہ — مصلحت در دیں عیسیٰ غار و کوہ

ایک جگہ مقام نبوت پر گفتگو کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لئے برگ حشیش — جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

شاید ان اشعار کو سنکر آپ پوچھیں کہ خودی اور اسکی مستی کردار کی نسبت فلسفیانہ گفتگو کرتے کرتے اقبال ایک کٹ ملّا کی طرح مذہبی جہاد کا وعظ کیوں دینے لگے۔

اس اعتراض کا جواب سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ آپ اقبال کے فلسفہ کے بعض اور اجزا پر غور کریں جنکے بغیر خودی کی تکمیل نہیں ہوئی۔ اقبال کے نزدیک خودی کی تربیت کیلئے چند چیزیں ضروری ہیں مثلاً عشق، عشق کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

عشق دم جبرئیل عشق دل مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول عشق خدا کا کلام،

ایک جگہ فرماتے ہیں

جوہر زندگی ہے عشق جوہر عشق ہے خودی — آہ کہ ہے یہ تیغ تیز پردگی نیام ابھی

عشق کے ساتھ فقر کو بھی وہ خودی کی تربیت کے لئے لازم قرار دیتے ہیں لیکن اقبال کا فقر بیکسی و بیچارگی کا ہم معنی نہیں۔ وہ فقر کی ان الفاظ میں تفسیر کرتے ہیں:۔

فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست — ما امینیم ایں متاعِ مصطفیٰ است

فقر کافر خلوت دشت و دراست — فقر مومن لرزۂ بحر و براست،

مرد حر کے فقر کی تعریف میں فرماتے ہیں۔

پادشاہاں در قبا ہائے حریر　　زرد رو از سہم آں عریاں فقیر

اب فلسفۂ خودی کو عشق اور فقر سے ملا کر دیکھئے۔ عشق خودی کے اندر حق کی تڑپ پیدا کرتا ہے۔ فقر خودی کو غیر حق سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ دونوں میں صرف زاویۂ نگاہ کا فرق ہے ورنہ عشق بغیر فقر کے اور فقر بغیر عشق کے مکمل نہیں ہوتا۔ بہرحال ان دونوں اجزا کے مجموعہ کا نام توحید ہے۔ توحید ہی اقبال کے تمام فلسفۂ جہاد کی جان ہے یوں سمجھئے کہ جہاد توحید کا عملی پہلو ہے:۔

پیش غیر اللہ لا گفتن حیات　　تازہ از ہنگامۂ او کائنات

ہر دو تقدیر جہاں کاف و نون　　حرکت از لا زاید از اِلاّ سکون

مومن جب لا الٰہ کہتا ہے تو یہ تمام باطل کے اصنام اور ناحق کی قوتوں کے خلاف اعلان جہاد ہے لیکن جہاد کا مفہوم اس تخریبی پہلو ہی تک محدود نہیں۔ لا الٰہ کہنے کے بعد اِلاّ اللہ کہنے سے اس حقیقت کا اظہار ہوتا ہے کہ یہ تخریب دراصل حق کی تعمیر کے لئے تھی۔ غرض جہاد کا مفہوم سمجھنے کے لئے "لا" اور "اِلاّ" دونوں کی تفسیر ضروری ہے۔ اگر کسی شخص کی نگاہ ایک ہی پہلو تک محدود رہ گئی تو اس نے جہاد کی حقیقت کو نہیں پایا۔ ایک شخص حق پر ایمان رکھتا ہے لیکن اپنی قوتوں کو باطل کے خلاف جنگ کرنے میں نہیں استعمال کرتا تو اس سے تعطل اور قوم کی موت کا سامان پیدا ہوتا ہے یہی غلطی جیسا کہ علاّمہ موصوف نے اپنے خط میں تحریر فرمایا ہے اکثر ہند اور ایران کے متصوفین نے کی۔ یعنی عشق الٰہی کے ساتھ انھوں نے صحیح فقر (یعنی غیر اللہ کی نفی) کی شان کو نہیں سمجھا۔

دوسری طرف اگر کوئی شخص صرف لا الٰہ پر رک جاتا ہے اور اِلاّ کو نہیں مانتا تو اکثر اس کی قوتیں باطل کی حمایت اور ناحق کوشی میں صرف ہوتی ہیں۔ یہ بھی انسانیت کے لئے پیغام اجل ہے۔ اقبال روس سے اس کی مثال پیش کرتے ہیں۔

روس را قلب و جگر گردید خوں　　از ضمیرش حرف لا آمد بروں

آں نظام کہنہ را برہم زد است　　تیز نیشے بر رگ عالم زد است

کردہ ام اندر مقاماتش نگہ | لا سلاطین لا کلیسا لا الٰہ
فکر او در تند باد لا بماند | مرکب خود را سوئے الّا نراند
در مقام لا نیا ساید حیات | سوئے الّا می خرامد کائنات
لا و الّا ساز و برگِ اُمتاں | نفی بے اثبات مرگِ امتاں

(یعنی اُس کا قلب اور جگر خون ہو گیا تو اس کے ضمیر سے 'لا' کی آواز بلند ہوئی اس کہنہ نظام کو اس نے درہم و برہم کر ڈالا اور عالم کے نظم و نسق پر ایک کاری ضرب لگائی۔ میں نے اس کے حالات کا مطالعہ کیا تو پایا کہ وہ بادشاہت مذہب اور خدا سب کا منکر ہے۔ درحقیقت اس کا تخیل "لا" کی تیز آندھی میں پھنسا رہ گیا۔ اس نے اپنے مرکب کی باگ "الا" کی طرف نہیں موڑی۔ لیکن زندگی لا کے مقام پر ٹھہرتی نہیں۔ پھر کائنات آہستہ آہستہ الا کی طرف آتی ہے۔ لا اور الا دونوں قوموں کا سازوبرگ ہیں۔ لیکن نفی (لا) بغیر اثبات (الا) کے قوموں کے لئے پیغام اجل ہے)

مختصر یہ ہے کہ اقبال کا جہاد تمام تر مصلحانہ اور باطل اور ناحق کوشی کے خلاف ہے چونکہ فتنہ و فساد کی اصلاح اور سرکش طبیعتوں کی روک تھام بغیر قوت کے استعمال کے ممکن نہیں اس لئے انسانیت کی ہمدردی اور حق و انصاف کی حمایت میں قوت کو کام میں لانا ضروری ہے۔

رگِ کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم | عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

حقیقتاً یہ اصلاحی جہاد امن عالم کیلئے ضروری اور اہل عالم کے لئے باعث صد برکت ہے۔ کوئی عملی مذہب یا معقول نظام اخلاق جہاد سے مستغنی نہیں ہو سکتا۔

اقبال کی نئی شاہراہ

آفتاب احمد صاحب صدیقی زردولوی)
متعلم بی۔ اے آنرز

دیر است کہ آوازۂ منصور کہن شد
من از سر نو جلوہ دہم دار و رسن را

میں اِس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس رفیع الشان خدمت ادبی کے لئے اس دور میں ایسے بلند پایہ حضرات کا قحط نہیں جو مجھ سے کہیں بہتر طریقہ سے اِس فرض کو انجام دے سکیں۔ لیکن قرعۂ فال بنام من دیوانہ زدند۔

بہر حال اپنی متاع فرسودہ، تہی دامنی، اور کم مائگی کا اندازہ کرتے ہوئے بھی مستعد ہوگیا ہوں۔ خداوند قدوس کی بارگاہ میں دست بدعا ہوں کہ وہ مناسب صورت میں اِس کا اتمام کرائے۔

اس دور کے اہل قلم حضرات کی یہ سنت جاریہ ہے کہ وہ کسی کے کلام کی عظمت و بزرگی، اُس کی خصوصیت اُس کی ہمہ گیری، اور اسکی جامعیت پر کچھ لکھنے کی صورت میں دوراز کار اور غیر ضروری مباحث شامل کردیا کرتے ہیں جس سے مقصود صرف اپنی "قوت انشار" اور "وسعتِ معلومات" کا بے محل مظاہرہ ہوتا ہے اور جو بسا اوقات اصل مقصود کی طرف ذرا بھی رہنمائی نہیں کرتا۔ میں اپنی افتاد طبع سے مجبور ہوں۔ مجھے "غیر معصوم" اور "متکلفانہ" راہوں پر چلنا اور اپنے قلم کی جولانیاں دکھانا کبھی گوارا نہیں۔ میں ان غیر ضروری مباحث سے دور رہ کر اس وقت صرف وہی بیان کرونگا جو میں بیان کرنا چاہتا ہوں یا جو مجھے بیان کرنا ہے۔

ریاضؔ کی خمریات، رواںؔ کی رباعیات، حالیؔ کی کار آمد رقت پسندی، فانیؔ کی حقایق نگاری جگرؔ کا تڑپنے اور تڑپا دینے والا سوز و گداز، حسرتؔ کا انوکھا اور اپنی نوعیت کا بالکل نیا مگر جاذب نظر طرز اور اصغرؔ کا معصوم و رنگا رنگ انداز بیان۔ بیشک یہی وہ آیتیں ہیں جن کی نبوت شاعری محتاج ہے۔ مگر اب میں ناظرین کی نظر التفات کو اُس شخص کے کارنامہائے نظم کی طرف مبذول کرنا چاہتا

ہوں جس نے ہمارے بے حس کاروانِ حیات میں اپنی بانگ درا سے ایک لرزش۔ ایک سیمابیت پیدا کی۔ جس نے بالِ جبریل، سے اُنھیں سوئے ہوؤں کو درس بیداری دیا اور پھر جس نے ضربِ کلیم سے اُنکے محکوم سینوں پر ایک ضرب کاری لگا کر اُنھیں سمجھانے کی کوشش کی ہے ؎

خواب نوشین بامداد رحیل　　　　بازدارد پیادہ راز سبیل

آج اقبالؔ شاعری کے اس دور میں ہے جس کی ہوا بھی کسی کو نہیں لگی۔ اُسکی دنیا الگ ہے اُسکے خیالات الگ ہیں اور اُسکے جذبات الگ۔ شاعری یا شعر کی سب سے بڑی تعریف یہ کیجاتی ہے کہ وہ تھوڑی دیر کے لئے ہمیں بے حس و حرکت کردے۔ اور ہمیں دنیا کی ہر شے سے بے نیاز بنا دے۔ یہانتک کہ ہم اپنے وجود کو کم ازکم تھوڑی دیر کے لئے بالکل فراموش کردیں۔ مگر اقبال کی شاعری۔ یا شعر سے ہم پر بالکل مختلف اثر پڑتا ہے۔ اُس کے شعر کا ایک ایک حرف ہمارے جذبات کا محرک ہے، ایک ایک لفظ ہم میں احساس خودی پیدا کرتا ہے اور اس کا ایک ایک مصرع ہم جیسے لوگوں کے لئے جو محکومی کے زنداں میں پڑے ہوئے سسکیاں لے رہے ہیں پروانۂ رہائی لیکر آیا ہے۔ ہم سو رہے ہیں وہ ہمیں جگانا چاہتا ہے۔ ہم بزدل اور نکمے ہیں وہ ہم میں حرارت پیدا کرکے حرکت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ہم اپنی خودی کو فراموش کر بیٹھے ہیں وہ ازسرِ نو ہمارے جسم میں خودی کی لہر دوڑا دینا چاہتا ہے۔

اقبال اور شعراء کی طرح طلسم الفاظ میں پھنسکر اپنے پیغام سے غافل نہیں ہوتا۔ اُس کا ارادہ مضبوط اور اٹل ہے۔ مثلاً معراج کے عنوان سے اس کی یہ نظم ؎

دے ولولۂ شوق جسے لذّتِ پرواز　　　　کرسکتا ہے وہ ذرہ مہ و مہر کو تاراج

مشکل نہیں یارانِ چمن معرکہ باز　　　　پرسوز اگر ہو نفسِ سینۂ دراج

ناوک ہے مسلماں ہدف اُس کا ہے ثریا　　　　ہے سِرِّ سراپردۂ جاں نکتۂ معراج

تو معنیِ النجم نہ سمجھا تو عجب کیا　　　　ہے تیرا مد و جزر ابھی چاند کا محتاج

الفاظ کے اس گورکھ دہندے میں بھی وہ اپنے پیغام سے غافل نہیں۔ مسلمانوں کو عروج سے پستی

میں دیکھکر اُس کے دل میں ایک ٹیس لگتی ہے اور وہ تلملا کر چیخ اُٹھتا ہے کہ ؎

تن بہ تقدیر ہے آج اُن کے عمل کا انداز | تھی نہاں جنکے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا | کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

کیا یہ دو شعر قوم کی حالت کا مرثیہ نہیں ہیں اور یقیناً ہیں مگر ان میں بھی ایک تعمیری شان مضمر ہے۔ کیا وہ غیرت دلا دلا کر ہمیں ابھار نہیں رہا ہے۔ کیا اِن سے اُسکی مجروح روح کا نقشہ نگاہوں کے سامنے نہیں آجاتا۔ کیا یہ اُس کے دکھے ہوئے دل کے ترجمان نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں سینہ کوبی کی آن اور گریہ وزاری کی شان نہیں۔ رونا اور ماتم کرنا اُس کے مذہب میں بزدلی کا دوسرا نام ہے۔ وہ رو رو کر اور رُلا رُلا کر قوم کو اور زیادہ نکّما نہیں بنانا چاہتا۔

زندگی کا مقصد اقبال کے نزدیک خودی۔ خودنگری۔ خودپرستی۔ خودشماری اور خودداری ہے۔ جس کے ثبوت کے لئے اس کے یہ اشعار کافی ہیں ؎

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی | وہ صدف کیا ہے جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خودنگر و خودگر و خودگیر، خودی | یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے

روح اسلام کی ہے نورِ خودی نارِ خودی | زندگانی کے لئے نارِ خودی، نورِ حضور
یہی ہر چیز کی تقویم یہی اصلِ نمود، | گرچہ اس روح کو فطرت نے رکھا ہے مستور
لفظ "اسلام" سے یورپ کو اگر کد ہے تو خیر | دوسرا نام اسی دین کا ہے فقرِ غیور

اقبال اگر ایک طرف ہمارے درخشاں ماضی کی داستان بیان کرتا ہے ہم کو ہماری پرانی عظمت اور کھوئی ہوئی بزرگی کی یاد دلاتا ہے اور ہمارے حال کی ذلت وخواری کا دلشکن خاکہ دکھا دکھا کر ہمیں شرم و غیرت دلاتا ہے تو دوسری طرف ہمارے سنہرے مستقبل کی پیشین گوئی کر کے ہمیں ناامیدی کی مایوسیوں سے باز رکھتا ہے۔ اُسکے یہ دو مصرعے ہمارے اس دعوی کی تسلی بخش تفصیل پیش کر رہے ہیں ؎

اب ترا دور بھی آنیکو ہے اے فقرِ غیور　　کھا گئی روحِ فرنگی کو ہوائے زر و سیم

اقبال نے جہاں ہماری روز افزوں جمود و بے حسی۔ بے غیرتی اور بے ہمتی کا رونا رو کر ہمارے دلوں میں ایک ٹیس پیدا کر رکھی ہے وہاں اُس نے موجودہ صوفی و ملا، فقیہ و شاعر، اور زاہد و مومن کو بھی بغیر عریاں کئے نہ چھوڑا یہی نہیں بلکہ اُن کی عریانیوں کو منظرِ عام پر لا کر ہمیں عبرت حاصل کرنے کا بھی موقع دیا ہے ؎

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں　　بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست
فقیہِ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور　　کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگ دست بدست

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال　　ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق　　افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھکو　　ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار

آج کل کے نوجوانوں کے سامنے ہمارے دیگر شعرا حضرات نے اپنے جو خیالات پیش کئے ہیں یا کرتے ہیں وہ یا تو زلف و گیسو، میت و جنازہ۔ شمع تربت اور گورِ غریباں تک محدود ہیں یا پھر انھوں نے معشوق کے ناز و غمزے، بناؤ سنگار، اور اُس کے جوبن پر اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں، کوئی کہتا ہے کہ ؎

تاروں کے لوٹنے کی ادا اُن کو بھا گئی
افشاں لگا لگا کے چھڑائی تمام رات

کوئی فرماتا ہے ؎

شمع نے آگ دھری سر پہ قسم کھانے کو
بخدا میں نے جلایا نہیں پروانے کو

کوئی صاحب۔ ن۔ دھا۔ یا رگا۔ رے۔ سا کا لحاظ رکھتے ہوئے چیخ اٹھتے ہیں ؎

تیری جفا قبول مگر یہ رہے خیال
ہم پھر نہ مل سکیں گے اگر ہم نہیں رہے

کوئی سلاسل ہجر میں مبتلا ہے تو کوئی سلما کی زلفِ گرہ گیر میں پھنس کر قلابازیاں کھا رہا ہے۔ کوئی ہجر میں آنسو بہا رہا ہے تو کوئی وصال کی اُمید موہوم کے سہارے زندگی کے تلخ لمحوں کو گذارنے کی کوشش میں ہمہ تن جدوجہد ہے۔ پوچھئے کہ آخر اس دردسری سے اُنھیں کیا فائدہ ہوا اور کیا ملک و قوم نے اُس سے نصیحت حاصل کی۔ (یہ ضرور ہوتا ہے کہ انھیں عاشقی کرنا آجاتا ہے۔ ہائے ہائے سے بخوبی واقف ہوجاتے ہیں اور ٹھنڈی سانسوں میں اُنھیں ایک خاص قسم کی لذت محسوس ہونے لگتی ہے) نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وہ گنے چنے حضرات بھی 'بسیر اندا ختم' کہہ اُٹھنے پر مجبور ہوجاتے ہیں جن سے مادرِ قوم و ملت کو کچھ نہ کچھ توقع ضرور تھی۔

برخلاف اس کے اقبال جو اپنے دل و دماغ کی متاع اُن کے حضور میں پیش کرتا ہے۔ وہ یہ ہے ؎

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی — ہو جسکے جوانوں کی خودی صورتِ فولاد
ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے — وہ عالمِ مجبور ہے، تو عالمِ آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے فقط جوشِ طلب ہے — پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خداداد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا — پُردم ہے اگر تو تو نہیں خطرۂ افتاد

اقبال ایک ایک طرح سے نہیں بلکہ ہزار ہزار طرح سے نوجوانوں کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے اُن میں جوشِ عمل پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اُنکی مردہ دلی کو زندہ دلی میں بدلنے کے لئے ہمہ تن جدوجہد ہے وہ نوجوانوں کو نئے نئے راستوں سے گھما گھما کر پھر اُسی تنفر میں لے آتا ہے جہاں پہونچکر انھیں حق و باطل میں تمیز ہوسکے۔ جہاں وہ اپنی تباہیوں کو بہ نظر خود دیکھکر جوش و غصہ سے بیتاب ہوجائیں

اور اُن کی رگوں میں خون عمل دوڑنے لگے۔ اور اُن میں از سرِ نو ایک ولولۂ حیات پیدا ہو جائے۔
اقبال نے کس انوکھے انداز سے اپنی اس نظم "ابلیس کا فرمان اپنے سیاسی فرزندوں کے نام" میں انہیں غیرت دلائی ہے کہ سبحان اللہ ؎

لا کر برہمنوں کو سیاست کے پیچ میں	زناریوں کو دیرِ کہن سے نکال دو
وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا	روحِ محمدؐ اس کے بدن سے نکال دو
فکرِ عرب کو دیکے فرنگی تخیلات	اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو
افغانیوں کی غیرتِ دیں کا ہے یہ علاج	ملا کو اُنکے کوہ و دمن سے نکال دو
اہلِ حرم سے اُنکی روایات چھین لو	آہو کو مرغزارِ ختن سے نکال دو
اقبال کے نفس سے ہے لالہ کی آگ تیز	ایسے غزل سرا کو چمن سے نکال دو

ایک جگہ اقبال نے ہماری بے کسی اور بے بسی۔ ہماری پریشاں حالی۔ ہماری بڑھتی ہوئی کمزوری اور ہماری ذہنی پستی کا خاکہ کچھ ایسے درد بھرے انداز میں ہمارے سامنے پیش کیا ہے جس پر بے اختیار آنسو نکل آتے ہیں۔ وہ ہم سے گلہ طراز ہے کہ ؎

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک	بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے
دہقاں ہے کسی قبر کا اُگلا ہوا مردہ	بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیرِ زمیں ہے
جاں بھی گروِ غیر بدن بھی گروِ غیر	افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے
یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو	مجھکو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

اقبال کا مقصد کیا ہے۔ اُس کی نظروں میں زندگی کا مفہوم کیا ہے۔ وہ ہم میں کونسی تبدیلی دیکھنے کا آرزومند ہے۔ وہ ہمیں کیا ہدایت کرنا چاہتا ہے۔ مغرب نے ہم پر کون سا اثر ڈالا ہے۔ ہم کیوں دل شکستہ ہو گئے ہیں۔ کیوں ہم میں وہ جرارت۔ وہ عزم و استقلال نہیں رہا جس کی وجہ سے ہماری اسلاف کبھی حکومت کر چکے ہیں یہ سب اُن کی اس نظم سے صاف ظاہر ہے ؎

اے پیرِ حرم رسم و رہِ خانقہی چھوڑ
مقصود سمجھ میری نوائے سحری کا

اللہ رکھے تیرے جوانوں کو سلامت
دے اُنکو سبق خود شکنی، خود نگری کا

تو اُن کو سکھا خارہ شگافی کے طریقے
مغرب نے سکھایا اُنھیں فن شیشہ گری کا

دل توڑ گئی ان کا دو صدیوں کی غلامی
دارو کوئی سوچ انکی پریشاں نظری کا

کہہ جاتا ہوں میں جوشِ جنوں میں ترے اسرار
مجھکو بھی صلا دے مرے آشفتہ سری کا

بخوفِ طوالت میں فی الحال اس مضمون کو اسی جگہ ختم کئے دیتا ہوں۔"

اقبال اور اردو غزل

از قمر الدین خاں صاحب متعلم ایم۔ اے
ایڈیٹر علی گڑھ میگزین (انگریزی)

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ — کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

کہا جاتا ہے کہ اردو غزل گوئی کا دور ختم ہو گیا، نہ تو اب اس کے لئے مواد میسر ہے اور نہ ایسی شاعری زمانے کو درکار ہے بعض ترقی پسند اصحاب تو یہ کہنے پر اتر آئے ہیں کہ غزل کی آئندہ افزائش سے اردو ادب و اردو شاعری خطرے میں ہے، یہ شبہات اور یہ محاکمے عوام کو کتنے ہی بے معنی اور مضحکہ خیز کیوں نہ معلوم ہوتے ہوں کچھ تو اصلیت ضرور رکھتے ہیں، اس مسئلہ پر ہمارے ہمعصر اردو رسائل و اخبارات وقتاً فوقتاً تنقید و تبصرہ کرتے رہتے ہیں لہذا مناسب نہیں معلوم ہوتا کہ صرف اس بنا پر مضمون ہذا کو خواہ مخواہ طوالت دیجائے تاہم یہ بتلانا ضروری ہے کہ آخر اس نکتے کا اس مقام پر کیوں تذکرہ کیا گیا، واقعہ یہ ہے کہ نہ تو اردو میں شعراء کی کبھی کمی رہی ہے اور نہ انشاء اللہ اس کی کبھی امید کی جا سکتی ہے، اردو ملقے میں کچھ نہیں تو پچاس فیصدی شاعر ضرور ہونگے باقی پچاس فیصدی بھی اگر وہ عبارت صحیح طور پر پڑھ سکتے ہیں تو شعر گوئی کے ذوق سے محروم نہ ہونگے، ہاں یہ ممکن ہے کہ ان کو قافیہ اور ردیف کی جستجو میں سر کھپانا پڑتا ہو یا بادامی کاغذ پر چھپے ہوئے پرانے خستہ دواوین کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہو، ملک میں چھوٹے بڑے اردو کے ہزاروں رسائل شائع ہوتے ہیں، ان کی خاص زینت یہی غزلیں ہوتی ہیں، ان غزلوں کو پڑھتے وقت چند منٹ کے لئے ہم ایک اجنبی اور غیر فطری دنیا میں منتقل ہو جاتے ہیں، چند لمحوں کے لئے دماغ میں پریشان اور مصنوعی تخیلات کا ہجوم ہو جاتا ہے (اس میں ذرا شبہ نہیں کہ دل ان چیزوں سے بسا اوقات ناآشنا رہتا ہے) بہت جلد یہ کیفیت محو ہو جاتا ہے اور پھر یہ یاد نہیں رہتا کہ کیا پڑھا اور کس کا کلام تھا، کبھی کبھی انھیں تاریکیوں میں نور کی جھلک نظر آجاتی ہے اور ہم نہایت مشتاقانہ نگاہوں سے دیکھنے لگتے ہیں "حسرت" "فانی" "جگر" "اصغر" وغیرہ وغیرہ، بہر حال یہ جگمگاہٹ بھی دیر پا نہیں ہوتی، تھوڑا سا محظوظ ہو کر ہم سوچنے لگتے ہیں

"کیوں! کیا میرؔ، سوداؔ، غالبؔ، مومنؔ میں یہ باتیں نہ تھیں۔ بیشک تھیں" چنانچہ ہم اِن چند نئے معیاری شعراء کی طرف بھی سچے دل سے ملتفت نہیں ہوتے، پھر ایسے ماحول میں، ایسی آب و ہوا میں کسی غزل گو شاعر کو اگر خاص طور پر اہمیت دیجائے تو اِس مخصوص توجہ کی توجیہہ ضروری ہے، ذیل کی سطور اسی روش میں لکھی گئی ہیں۔

یوں تو اقبالؔ کو شعرائے عالم کی صف اول میں جگہ ملتی ہے، اور وہ اس صف کے مقتدی نہیں بلکہ اس کی امامت کے حقداروں میں سے ہے، لیکن فی الوقت، ہم کو اپنے شاعر کی ایک خاص صنف کلام سے بحث ہے، قریب حال تک اقبال کی پرستش ایک نظم گو شاعر کی حیثیت سے ہوتی تھی اور خدانخواستہ اگر اقبالؔ کی اُردو شاعری کی تمام کائنات بانگ درا ہی ہوتی تو شاید اس حقیقت پر کسی کو اعتراض کا موقعہ نہ ہوتا، مگر بال جبریل اور ضرب کلیم کی اشاعت سے اُردو غزل میں جو انقلاب ہوا ہے اس کو نہ تو ہم نظر انداز کر سکتے ہیں اور نہ ہماری آیندہ نسلیں۔

بانگ درا کا بیشتر حصہ نظموں پر مشتمل ہے، شاعر کے دوران زندگی کے مطابق کتاب تین حصوں پر منقسم ہے، ہر حصہ کے اختتام پر چند غزلیں بطور شیرینی کے اضافہ کر دی گئی ہیں، آئیے پہلے ہم مختصر طور پر انھیں غزلوں کا جائزہ لیں اور معلوم کریں کہ ان میں اور دیگر شعرائے ماضی و حال کی غزلوں میں کیا فرق ہے، کیا ان میں کوئی انفرادیت ہے اور ہے تو اس کی نوعیت کیا ہے۔

بادی النظر میں تو کوئی ایسا فرق نہیں معلوم ہوتا حُسن محبوب کی سحرکاریاں تپش شوق، معشوق کے تغافل کا شکوہ، ہجر کی دلگدازیاں، رقابت کی مار، عہد بندیاں اور وعدہ خلافیاں، کلیم و طور، واعظ کی مذمت، صیاد و آشیانے کی سرگزشت، بجلی کا قفس پر گرنا، فلک کا ظلم بے بنیاد، حوادث زمانہ، ہستی فانی، غرضیکہ وہ تمام مضامین اقبال کے یہاں موجود ہیں جن سے ہمارے بزرگوں کے بیشمار دیوان بھرے پڑے ہیں، مثلاً:۔

گلزار ہست و بود نہ بیگانہ وار دیکھ ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھ

آیا ہے تو جہاں میں مثالِ شرار دیکھ ۔۔۔ دم دے نہ جائے ہستیٔ ناپائدار دیکھ
مانا کہ تیری دید کے قابل نہیں ہوں میں ۔۔۔ تو میرا شوق دیکھ، مرا انتظار دیکھ

نہ آتے ہمیں اس میں تکرار کیا تھی ۔۔۔ مگر وعدہ کرتے ہوئے عار کیا تھی
تامل تو تھا ان کو آنے میں قاصد ۔۔۔ مگر یہ بتا طرز انکار کیا تھی
کھنچے خود بخود جانب طور موسیٰ ۔۔۔ کشش تیری اے شوق دیدار کیا تھی

عجب واعظ کی دینداری ہے یا رب ۔۔۔ عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
ہم اپنی دردمندی کا فسانہ ۔۔۔ سنا کرتے ہیں اپنے رازداں سے

لاؤں وہ تنکے کہیں سے آشیانے کیلئے ۔۔۔ بجلیاں بیتاب ہیں جنکو جلانے کیلئے
وائے ناکامی فلک نے تاک کر توڑا اسے ۔۔۔ میں نے جس ڈالی کو تاڑا آشیانے کیلئے
پاس تھا ناکامیٔ صیاد کا اے ہم صفیر ۔۔۔ ورنہ میں اور اڑ کے جاتا ایک دانے کیلئے

جائے حیرت ہے برا سارے زمانہ کا ہو نہیں ۔۔۔ مجھکو یہ خلعت شرافت کا عطا کیونکر ہوا

اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم ۔۔۔ طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی
نظارے کو یہ جنبش مژگاں بھی بار ہے ۔۔۔ نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

مگر اس دور کے کلام میں بھی بعض ایسے نکتے ملتے ہیں جن کو دیکھ کر ایک سطحی نظر بھی پھڑک اٹھتی ہے، سب سے پہلی چیز زبان کی انفرادیت بلکہ اس کا انوکھا پن ہے، نفس مضمون سے بحث

نہیں شاعر کے الفاظ و محاورات غزل کی رسمی پابندیوں سے بہت زیادہ آزاد معلوم ہوتے ہیں، اتنا اندازہ تو ہر شخص کو ہو جاتا ہے کہ اقبال کے پیشروؤں یا اس کے ہمعصروں میں سے غزل کے لئے ایسی زبان کبھی کسی نے استعمال نہ کی۔ مثلاً۔

چمن زار محبت میں خموشی موت ہے بلبل ۔ یہاں کی زندگی پابندئ رسمِ فغاں تک ہے

میں انتہائے عشق ہوں، تو انتہائے حسن ۔ دیکھے مجھے کہ تجھکو تماشا کرے کوئی ۔

نہیں بیگانگی اچھی رفیقِ راہ منزل سے ۔ ٹھہر جا اے شرر ہم بھی تو آخر مٹنے والے ہیں

مجھے روکے گا اے ناخدا کیا غرق ہونے سے کہ جن کو ڈوبنا ہو ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

مدام گوش بہ دل رہ یہ ساز ہے ایسا جو ہو شکستہ تو پیدا نوائے راز کرے

---

(۲) اب تک اردو غزل کے دامن میں سوائے چند عشقیہ مضامین کے اور کچھ نہ تھا، اسی وجہ سے غزل کی ایک مخصوص زبان بن گئی تھی، اردو غزلوں میں فسانہ عشق کے علاوہ بھی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن ان کا مفہوم بھی صرف ان منتخب الفاظ و محاورات سے ہی ادا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ غالب اس نظریئے کی کس لطیف پیرائے میں مدافعت کرتا ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

بہر حال یہ نظریہ کسی طور پر صحیح نہیں، یہی چیز تھی جس کے خلاف اول اول حالی نے علم احتجاج بلند کیا، ایک عرصے تک اردو پبلک حالی کو پاگل اور سرپھرا کہتی رہی، مگر خوش قسمتی سے حالی

کو اقبالؔ اور حسرتؔ جیسے پیروکار ان کی زندگی ہی میں میسر آ گئے، اقبال کی ان تمام غزلوں میں جو بانگ درا میں ملتی ہیں عشقیہ مضامین برائے نام ہیں، بعض بعض غزلیں تو پوری کی پوری سیاسی رنگ میں ڈوبی ہوئی ہیں، مثلاً:

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا — بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے
کہاں کا آنا کہاں کا جانا، فریب ہے امتیاز عقبیٰ — نمود ہر شے میں ہے ہماری کہیں ہمارا وطن نہیں ہے
مدیر مخزنؔ سے کوئی اقبالؔ جا کے میرا پیام کہدے — جو کام کچھ کر رہی ہیں قومیں انھیں مذاق سخن نہیں ہے

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا — سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
دیار مغرب کے رہنے والو خدا کی بستی دوکاں نہیں ہے — کھرا جسے تم سمجھ رہے ہو وہ اب زر کم عیار ہوگا

---

(۳) سیاسیات کے مسائل سے تو اقبال کا تمام کلام بھرا پڑا ہے، لیکن ہمارا شاعر محض سیاسی پیغامبر ہی نہیں بلکہ مصلح قوم و ملت اور ایشائی تہذیب کا بہت بڑا حامی اور پرستار ہے، مغرب کے تمدن کو وہ ان الفاظ میں یاد کرتا ہے ؎

تمھاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی
جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا

یورپ اور امریکہ کے حسن اور عریانی پر آج ایک دنیا جان دیتی ہے لیکن شاعر مشرق کا تجربہ ہے:

میں نے اے اقبالؔ! یورپ میں اسے ڈھونڈا عبث
بات جو ہندوستاں کے ماہ سیماؤں میں تھی

مغرب کی تقلید کو اقبال مشرق کی قوموں کے حق میں سم قاتل سمجھتا ہے ؎

تیرے پیمانوں کا ہے یہ اے مئے مغرب اثر　　خندہ زن ساقی ہے ساری انجمن بیہوش ہے

گیا ہے تقلید کا زمانہ، مجاز رخت سفر اٹھائے　　ہوئی حقیقت ہی جب نمایاں تو کس کو یارا ہے گفتگو کا

(۴) پہلے ہمارے شعرا یہ اپنا عین فرض سمجھتے تھے کہ شیخ و محتسب اور زاہد و عابد کو خواہ مخواہ برا بھلا کہا جائے، رندانہ اور لاابالی زندگی کو ہمیشہ پرہیزگاری کی زندگی پر ترجیح دی جاتی تھی۔ حالی نے اس نامعقول روش کے خلاف بہت آواز اٹھائی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ حالی کی آواز ویرانے میں صدائے بازگشت ہو کر رہ گئی۔ اس دور کے غزل گو شعرا نے حالی کی اصلاح کو نہایت بے التفاتی سے ٹھکرایا ہے، اقبال نے اس اصلاح پر پورا پورا عمل کیا ہے، اقبال نے جب کبھی بھی واعظ قوم کو مخاطب کیا ہے تو خود ریفارمر اور قومی رہنما کی حیثیت اختیار کی ہے اس کا مقصد محض عالموں اور مذہبی پیشواؤں کو جھٹلانا نہیں ہوتا۔ وہ اس جماعت کی کمزوریوں کا پول کھول دیتا ہے ؎

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب!　　عداوت ہے اسے سارے جہاں سے

بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں　　لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے!

اُمید حور نے سب کچھ سکھا رکھا ہے واعظ کو　　یہ حضرت دیکھنے میں سیدھے سادے بھولے بھالے ہیں

بٹھا کے عرش پہ رکھا ہے تو نے اے واعظ　　خدا وہ کیا ہے جو بندوں سے احتراز کرے

ہمارے علما کی آجکل یہ عام روش ہے کہ بات بات پر کفر کا فتویٰ صادر کر دیتے ہیں وہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کو اس کا حق حاصل ہے کہ عوام الناس کو جو چاہیں کہیں، مردود، بدعتی، ناری وغیرہ ایسے الفاظ تو ہر وقت ان کی زبان پر ہوتے ہیں۔

غرورِ زہد نے سکھلا دیا ہے واعظ کو
کہ بندگانِ خدا پر زباں دراز کرے

لیکن اپنے صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین کا جیسا احترام اقبال نے کیا ہے دیگر شعرا کو شاید ہی یہ توفیق عطا ہوئی ہے۔

تمنا درد دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی
نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں

نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو
یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں،

جنگ عظیم سے قبل کی غزلوں میں خیالات کا تنوع اتنا زیادہ نہیں ہے، اس وقت تک اقبال زیادہ تر نظم گو شاعر رہا ہے، نظمیں عموماً سیاسی، قومی اور اصلاحی تھیں، اقبال کا مقصد حیات مسلمانوں کو بالخصوص اور ایشائی اقوام کو بالعموم دوبارہ زندہ کرنا اور ان کو مغرب کی غلامی سے آزاد کرانا ہے، اقبال کی ساری شاعری اس مقصد کی ترجمان ہے، اس مقصد کی تکمیل کے لئے شروع شروع میں شاعر غزل گوئی پر نہیں مجبور تھا، یہی وجہ ہے کہ بانگ درا میں اتنی تھوڑی غزلیں ہیں، اور یہ غزلیں بھی تمام تر نظموں کے رنگ میں لکھی گئی ہیں، اس کتاب کو دیکھکر صاف پتہ چلتا ہے کہ آیندہ اگر اقبال نے اُردو غزل کے "گیسو" سنوارنے کی طرف توجہ کی تو اُردو ادب کا شانہ قیامت تک شاعر کے احسان سے ہلکا نہ ہوگا۔

(۵) بانگ درا کی غزلوں میں ایک اور بہت بڑی خصوصیت پائی جاتی ہے جو بعد میں بالِ جبریل کی خاص زینت ہوئی — غزل میں اب تک تسلسلِ تخیّل جائز نہیں خیال کیا جاتا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ بعض شعرائے متقدمین جیسے میرؔ اور غالبؔ غزل لکھتے لکھتے اس میں چند اشعار کا ایک قطعہ[1] اضافہ کر دیا کرتے تھے یا قطعات لکھتے تھے جن میں غزل کی خوبیاں موجود ہوتی تھیں، بہرحال یہ طرز نہ تو عام ہو سکی اور نہ عام طور پر اس میں کسی کو کامیابی ہوتی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ غزل کا سب

---

[1] (نوٹ) ہمیں فاضل مضمون نگار سے اتفاق نہیں۔ متقدمین کے دواوین میں اکثر مسلسل غزلیں موجود ہیں۔ (مدیر)

سے بڑا عیب اشعار کی اندرونی بیگانگی ہے'' اور چونکہ اردو شاعری میں یہ صنعت کلام بہت زیادہ مقبول ہے لہٰذا اس عیب نے ہماری شاعری کو سب سے زیادہ خراب کیا ہے، بقول حالی جب ہمارے شعرا غزل کہنے بیٹھتے ہیں تو پہلے قافیہ اور ردیف تلاش کرتے ہیں اور پھر اس شکنجے میں جو خیال پھنس سکا اسے پھانس دیا اور یونہی اندھا دھند لکھتے چلے جاتے ہیں۔ بانگ درا میں طرز مذکور کی بھی نہایت عمدہ غزلیں ملتی ہیں، مثلاً:

کبھی اے حقیقت منتظر نظر آ لباس مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبین نیاز میں
نہ کہیں جہاں میں اماں ملی جو اماں ملی تو کہاں ملی — مرے جرم خانہ خراب کو ترے عفو بندہ نواز میں
جو میں سر بسجدہ ہوا کبھی تو زمیں سے آنے لگی صدا — ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا — سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا
سُنا دیا گوش منتظر کو حجاز کی خاموشی نے آخر — جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا پھر استوار ہوگا

اس تمہید کے بعد اب میں بال جبریل کی غزلوں پر مفصل بحث کروں گا اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ غزل گوئی کے اعتبار سے شعرائے اردو میں اقبال کی کیا وقعت ہے۔

بال جبریل کی غزلیں دو حصوں پر منقسم ہیں۔ حصہ اول میں سولہ[16] غزلیں ہیں ان کا موضوع عشق الٰہی ہے، انسان نہایت آزادی وبیباکی سے اللہ تعالیٰ کو مخاطب کرتا ہے، یہ انسان ایک مکمل مسلمان ہے جو اپنے مالک سے کبھی تو شکوہ کرتا ہے، کبھی اس سے شوخی کرتا ہے، کبھی مختلف قسم کے بے باکانہ سوال پوچھتا ہے، کبھی اپنی ہستی پر ناز کرتا ہے۔ غرضکہ اس ایک موضوع میں صدہا دیگر مضامین شامل ہیں، لیکن آپس میں اس طرح جذب ہوگئے ہیں گویا کثرت میں وحدت سما گئی ہے۔ ہاں! اس مقام پر یہ کہدینا بھی لطف سے خالی نہ ہوگا کہ یہ غزلیں نہ محض اردو زبان میں

بلکہ مشرقی شاعری میں ایک نئے باب کا اضافہ کرتی ہیں۔ فارسی شاعری اپنی وسعت وعظمت پر جتنا بھی چاہے ناز کرے مگر واقعہ یہ ہے کہ وہاں بھی ان غزلوں کے نمونے خال خال ہی نظر آتے ہیں، یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ صوفیانہ شاعری بالکل دیگر چیز ہے، اس کو اقبال کے اس طرز سے لگاؤ تک نہیں،

معشوق حقیقی | جس طرح اقبال خود عام انسانوں سے بہت زیادہ بلند ہے اس نے اپنا معشوق بھی ایک ایسی ہستی کو انتخاب کیا ہے جو حسن مکمل یعنی خود اللہ تعالیٰ ہے جس کا حسن پائدار اور جس کا جمال لازوال ہے، اقبال عشق مجازی کا قائل نہیں کیونکہ اس میں بہت سے خطرے ہیں، وہ چند روزہ ہے، اس کا دوام اس کی بقا عارضی ہے ؂

وہ عشق جسکی شمع بجھا دے اجل کی پھونک
اس میں مزا نہیں تپش و انتظار کا

لیکن عالی ہمتی اور بلند حوصلگی کے ساتھ اقبال کو اس انتخاب میں ڈر بھی معلوم ہوتا ہے، کہیں اس کی بیباکی اور جسارت گستاخی نہ سمجھی جائے، چنانچہ وہ اپنے محبوب کو اس طرح مخاطب کرتا ہے ؂

میری بساط کیا ہے؟ تب وتاب یک نفس
شعلہ سے بے محل ہے الجھنا شرار کا

ابتدائے عشق | عاشق التجا کرتا ہے کہ میرا عشق بالکل نرالا ہے شاید میں دید کی تاب نہ لاسکوں لہذا ابھی تو بے نقاب ہو کر اپنا حسن نہ دکھا ؂

میں تو نیاز ہوں مجھ سے حجاب ہی اولیٰ - کہ دل سے بڑھ کے ہے میری نگاہ بے قابو

ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے ؂

حجاب اکسیر ہے آوارۂ کوئے محبت کو - مری آتش کو بھڑکاتی ہے تیری دیر پیوندی

پھر معشوق کی طویل بے التفاتی سے گھبرا کر اقبال پکار اٹھتا ہے ؂

تجھے یاد کیا نہیں ہے مرے دل کا وہ زمانہ — وہ ادب گہ محبت وہ گلہ کا تازیانہ

پھر کہتا ہے کہ یہ تمام کائنات اور یہ کل مخلوقات تو نے میرے ہی خاک وخون سے پیدا کی ہے اس کا کچھ تو صلہ دے، میں کونسے ایسے جرم کا مرتکب ہوں جو مجھ سے اتنی دوری برتتا ہے ؎

مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا — صلہ شہید کیا ہے؟ تب وتاب جاودانہ!

اور باوجود میری کوششوں کے باوجود تری مدح سرائیوں کے ؎

وہی میری کم نصیبی وہی تیری بے نیازی — مرے کام کچھ نہ آیا یہ کمال بے نوازی

میں اب تک نہیں سمجھا کہ میں کسی الجھن میں پڑ گیا ہوں کہاں ڈال دیا گیا ہوں، اور نہیں معلوم یہ میرا اپنا گھر ہے یا میں ترے کرشمے میں اسیر ہو گیا ہوں ؎

میں کہاں ہوں تو کہاں ہے؟ یہ مکاں کہ لامکاں ہے؟ — یہ جہاں مرا جہاں ہے کہ تری کرشمہ سازی؟

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں — کبھی سوز وساز رومی کبھی پیچ وتاب رازی

میرا تو یہ حال ہے اور تجھکو پرواتک نہیں، میرے نالوں سے، میری آہ وفغاں سے تیرا حرم گونج اٹھتا ہے میری نگاہیں ہمیشہ عرش پر ہی رہتی ہیں، اور اگرچہ میں اس کشمکش میں پڑا ہوا ہوں میرے دل کی آواز سچی اور دردناک ہے ؎

گرچہ ہے میری جستجو دیر وحرم کی نقشبند — میری فغاں سے رستخیز کعبہ وسومنات میں

لیکن ہائے! تو نے اپنی بے التفاتی اور اپنے تغافل سے میرے عشق کا راز فاش کر دیا ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا! مجھکو بھی فاش کر دیا — میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

عاشق کو یقین کامل تھا کہ اس کا عشق سچا تھا مگر روز محشر سوال وجواب شروع ہوا تو یہ بھی بلایا گیا اس کو اپنے فعل پر سخت ندامت ہوئی اور وہ بہت پشیماں ہو کر کہتا ہے ؎

عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی — داور محشر کو اپنا راز داں سمجھا تھا میں

اب وہ ہر طرح سے بیزار ہو کر بہت ادب سے شان محبوبی میں التجا کرتا ہے ؎

رگِ تاک منتظر ہے تری بارشِ کرم کی
کہ عجم کے میکدوں میں نہ رہی مے مغانہ

پھر بہ گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر
ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر

اگر تو پردے میں رہنا چاہتا ہے تو رہ مگر
ع یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر

میں ایک بہت چھوٹی سی چیز ہوں لیکن کاش تو اپنی وسعت میں اس ذرے کو سمو لیتا ؎

تو ہے محیط بیکراں میں ہوں ذراسی آبجو
یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

انتہائے شوق | عشق الٰہی میں شاعر اتنا مدہوش ہو جاتا ہے کہ تمام بندشوں سے اپنے کو آزاد سمجھنے لگتا ہے، اس آزادی کے عالم میں اقبال کی زبان سے جو اشعار نکلے ہیں ان میں سے ہر ایک بجائے خود ایک دریائے معانی اور شعریت کا کمال ہے، مضمون کی طوالت کے ڈر سے میں صرف چند مثالیں پیش کروں گا۔

اردو غزل میں ہجر اور معشوق کے مظالم کے مضامین بہت کثرت سے پائے جاتے ہیں لیکن اقبال کو ان فرسودہ اور لغو مضامین سے نفرت ہے اس کا محبوب قہار، ستمگار، ظالم اور قصائی نہیں، وہ اس کا دوست اور حبیب ہے، وہ اس سے دور رہ کر ہجر کا رونا نہیں روتا، وہ بزم یار میں بیچ کرنے تکلف ہو جاتا ہے اور بہت جلد صاحب محفل کا رازداں بننا چاہتا ہے۔ چنانچہ ایک ایسے ہی کیف میں آکر کہتا ہے ؎

لا پھر اک بار وہی بادہ و جام اے ساقی — یاد آ جائے مجھے میرا مقام اے ساقی

ایک دوسرے مقام پر شراب معرفت سے مدہوش ہو کر کس مزے سے کہا ہے ؎

مٹا دیا مرے ساقی نے عالم من و تو — پلا کے مجھ کو مے لا الہ الا ہو۔

ان غزلوں کی ایک بہت بڑی صفت شوخی ہے، اردو کی عام غزلوں میں بھی ناز و نیاز کے جھگڑے بہت پائے جاتے ہیں اور بعض اوقات بہت دلچسپ ہوتے ہیں، مگر اقبال کے یہاں یہی چیزیں کچھ اور ہی رنگ و صورت اختیار کر لیتی ہیں، اقبال کا خیال ہے کہ

بندہ اپنے مالک سے جتنی بھی شوخی کرے جتنا بھی ناز کرے کم ہے اور بجا ہے۔

شاعر ایک لمحہ کے لئے دنیا کی گمراہیوں اور بے اصولیوں سے متنفر ہو کر اس خیال میں محو ہوجاتا ہے کہ آخر کائنات عالم میں باوجود آئین قدرت کی مستحکم حکومت کے یہ بے عنوانیاں کیوں ہیں لیکن وہ فوراً سنبھل جاتا ہے اور خدا کو یوں مخاطب کرتا ہے ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا ۔ مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا!
اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا؟

مجھے یقین نہیں کہ آج تک دنیا کے کسی شاعر کو اتنی جرات ہوئی ہو جس نے اللہ تعالیٰ کو ان الفاظ میں یاد کیا ہو، یوں زبان تو ہر شخص کے منہ میں موجود ہے، ہر شخص کو اختیار ہے جو چاہے کہے، لیکن شاعر کا وجود عوام الناس سے مختلف ہوتا ہے، وہ ایک ایسی بات جس کو ہم صریحاً ناجائز اور مخرب اخلاق سمجھنے میں شعریت کے جامے میں اس طرح پیش کرتا ہے کہ ہم اس کے دلدادہ ہو جاتے ہیں، اس کے عیب کو مستحسن خیال کرنے لگتے ہیں اور اس کی گستاخی کو شوخی ادا سے تعبیر کرتے ہیں۔

انسان اپنی نافرمانی کی بدولت جنّت سے نکالا گیا، وہ دنیا میں آیا تو اپنے ساتھ ساتھ مصیبت و مشقت لایا، اس کے علاوہ اس کے جرم کو یاد دلانے کے لئے موت ہمیشہ اس کے سر پر سوار رہی، ہمارا شاعر اس واقعہ کو دوسری روشنی میں دیکھتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ سے کہتا ہے کہ البتہ میں نے قصور کیا جس کی پاداش میں جنّت سے نکالا گیا۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ نتیجہ ہوا کہ تیری جنّت اب تک ویران پڑی ہوئی ہے اس لطیف خیال کو شاعر کس حسن و خوبی سے ادا کرتا ہے ؎

قصور وار غریب الدیار ہوں لیکن ۔ ترا خرابہ فرشتے نہ کر سکے آباد

اور پھر کہتا ہے ؎

باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں　　　　کار جہاں دراز ہے اب میرا انتظار کر

یعنی جب تو نے ایک مرتبہ مجھ کو نکال دیا تو پھر کیوں بلاتا ہے، دنیا میں مجھکو بہت سے کام کرنے ہیں، جب فرصت ملے گی تو آؤنگا، یہ جلدی کیوں ہے یعنی موت وقت بے وقت کیوں آدھمکتی ہے!

دنیا کی بوقلمونیاں، بزم قدرت کی رنگ آرائیاں، فطرت کے عجائبات اور یہ کل کائنات اللہ تعالیٰ نے انسان کے لئے پیدا کیا، یہ سب چیزیں اسی کے زیر نگیں ہیں، اسی کے استفادہ کے لئے ہیں، لہٰذا انسان کو ان بے بہا نعمتوں کے صلہ میں خدا کا لاکھ لاکھ شکریہ ادا کرنا چاہیئے، مگر آپ سنئے کہ ہمارا شاعر جدت طراز کیسے شکریہ ادا کرتا ہے ؎

یہ مشت خاک، یہ صرصر، یہ وسعت افلاک　　　　کرم ہے یا کہ ستم تیری لذت ایجاد

شوخی کی چند اور مثالیں ملاحظہ ہوں :۔

متاع بے بہا ہے درد و سوز آرزو مندی　　　　مقام بندگی دیکر نہ لوں شان خداوندی

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا　　　　یہاں مرنے کی پابندی وہاں جینے کی پابندی

ضمیر لالہ مئے لعل سے ہوا لب ریز　　　　اشارہ پاتے ہی صوفی نے توڑدی پرہیز

اس پیکر خاکی میں اک شے ہے سو وہ تیری　　　　میرے لئے مشکل ہے اس شے کی نگہبانی،

اب کیا جو فغاں میری پہنچی ہے ستاروں تک　　　　تو نے ہی سکھائی تھی مجھ کو یہ غزل خوانی

چپ رہ نہ سکا حضرت یزداں میں بھی اقبال　　　　کرتا کوئی اس بندۂ گستاخ کا منہ بند

روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل　　　　آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

حصہ اول کی غزلوں کی جو سب سے بڑی خوبی تھی میں نے بیان کردی اس سلسلے میں ایک بات قابل توجہ یہ ہے کہ اگر غزل کا خاص موضوع ہم عشقیہ مضامین ہی رکھیں تو اس میں بڑی وسعت پیدا کی جاسکتی ہے، عشق مجازی، جو کہ ہمارے شعرا میں عموماً بناوٹ اور تکلف کے

سوا کچھ نہیں ہوتا) کے ساتھ اگر عشق حقیقی کو بھی غزل میں شامل کر لیا جائے تو اُردو کا دامن بہت دولتمند اور پاک ہو سکتا ہے، اس نئے مضمون کو اقبال نے جس حسن و خوبی سے باندھا ہے وہ شاید ہمیشہ کے لئے اپنی مثال آپ رہے، بہر حال آرٹ اور شاعری کی روشنی میں یہ اشعار نہ محض ایسڈیل ہیں بلکہ ادب عالم میں ان کو بہت بڑی جگہ ملتی ہے۔

اس حصے کی اور خصوصیات آگے آئیں گی۔

حصّہ دوم میں اکسٹھ غزلیں ہیں، دونوں حصوں کی اکثر غزلوں میں خیالات مسلسل ہیں لیکن ان میں غزل کی سب ضروریات موجود ہیں اسلئے ان کو نظم نہیں کہہ سکتے۔ حصوں کے پہلے حصے ہی میں لے اشارہ کیا تھا کہ اقبال نے اپنی غزلوں میں عشقیہ مضامین کو بہت کم جگہ دی ہے، بال جبریل کی بیشتر غزلیں زمانہ حال کی بہترین ترجمان ہیں، غیر ممالک کے ادبیات اُٹھا کر دیکھ لیجئے ہر زمانے کے شاعر یا مصنف کی تصنیف اس کے عہد کی تہذیب و تمدن کا آئینہ ہوئی ہے، اُردو نثر خواہ جیسی بھی ہو بہر حال اُردو شاعری کے کان تو اس چیز سے کبھی آشنا تک نہیں ہوئے آج ہم میرؔ، غالبؔ، داغؔ، انیسؔ، دبیرؔ کا کلام پڑھیں اور پھر پتہ لگائیں کہ یہ لوگ ہندوستان کی تاریخ میں کب گذرے تھے تو بھلا کیا پتہ چل سکتا ہے[1]، ہمارا رہنما صرف اُردو کی فلولوجی ہو سکتی ہے، اُردو کے موجودہ شعرا میں سے بہت کم اس عیب سے بری ہو سکتے ہیں، یہ چیز پہلے پہل سرزمین ہند میں صحیح معنوں میں اقبال ہی کی شاعری میں آئی، اول اول تو اس نے نظم کا جامہ پہنا، مگر جب شاعر کو اپنے اوپر پورا بھروسہ ہو گیا تو اس نے اُردو غزل کو بھی نظم کے مضامین سے آراستہ کیا، یہ کام اپنی جگہ پر بیشک بہت مشکل ہے لیکن ہم ابھی دیکھیں گے کہ اقبال کی یہ "نظمی غزلیں" دنیائے شاعری میں

---

[1] فاضل مضمون نگار نے اگر میرؔ اور دیگر شعراء کے ماحول کا مطالعہ کیا ہو تو وہ یقیناً محسوس کرینگے کہ یہ شاعر کس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ کیا میرؔ کی الم پرستی اور قنوطیت سے اس عہد کے تاریخی ماحول کا حال معلوم نہیں ہوتا۔ (مدیر)

کہاں تک کامیاب کہی جا سکتی ہیں۔

بال جبریل کی غزلوں میں جیسا کہ میں نے قبل تذکرہ کیا زمانہ حال کے ہر پہلو پر شاعرانہ و فلسفیانہ تبصرہ موجود ہے، تاہم بعض مضامین جن پر شاعر نے خاص طور پر زور دیا ہے اور جن کا بار بار اعادہ کیا ہے ترتیب دیئے جا سکتے ہیں۔

مسلمان اور اسلام | ضرب کلیم کے ایک باب کا بعینہٖ یہی عنوان ہے، بال جبریل میں یہ نفس شروع سے اخیر تک پیوستہ ہے، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اقبال کی کل شاعری کو اسی عنوان سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ بہرحال اس مقام پر ہمارا زاویہ نظر مصلحتاً محدود ہونا چاہیئے۔

کتاب کے صفحہ اول ہی پر یہ شعر درج ہے ؎

اُٹھ کہ خورشید کا سامان سفر تازہ کریں ۔۔۔ نفس سوختۂ شام و سحر تازہ کریں

مسلمان کو ہر قسم کی تعلیم دی گئی ہے جن میں قابل ذکر حسب ذیل ہیں:۔

فقر | گذشتہ آٹھ یا دس سال کے کلام میں اقبال نے اپنے کو قلندر کے نام سے یاد کیا ہے شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اب شاعر محض شاعر نہیں رہا بلکہ دنیائے اسلام کا فی زمانہ سب سے بڑا فلسفی تمدن اسلامی کا ایک بہت بڑا حامی و محافظ، تاریخ اسلام کا ایک مایہ ناز مورخ، اسلامیات کا ایک بہت بڑا عالم اور دور حاضرہ کا ایک پر مغز سیاسی مدبر۔ ابتدائے اسلام میں یہ خوبیاں ہمارے لیڈروں اور ہمارے اماموں ہوا کرتی تھیں، وہ نہایت سیدھے سادے مسلمان اور اللہ کے نیک بندے ہوتے تھے، انھیں بزرگوں کو اقبال نے اپنا نمونہ بنایا اور اسی اعتبار سے اپنے قلندری اختیار کی۔

فقر کے معنی فاقہ مستی نہیں، فقر کے معنی ہیں قناعت، استقلال، سادگی، میانہ روی، فقر کے معنی ہیں اسلامی روایات پر نہایت سختی سے پابند ہونا، فقر میں مستی ہے جلال ہے جمال ہے فقر میں قلندری ہے اور فقر میں سکندری ہے، در اصل اس لفظ کی تعریف مشکل ہے، بہرحال اقبال

نے فقر کے جو معنی لئے ہیں وہ ہم نے مختصراً بیان کر دئے۔ ذیل کے اشعار اس پر اور روشنی ڈالیں گے۔
فقر اپنی چھوٹی سی دنیا میں چین سے زندگی بسر کرتا ہے مگر اس کی نگاہ بہت تیز ہیں اور کاشف الاسرار ہوتی ہے، اس کو گدڑی میں لعل نظر آتے ہیں، وہ گدائی میں بادشاہت کے رموز پہچانتا ہے۔ ؎

فقیر راہ کو بخشے گئے اسرار سلطانی
بہا میری نوا کی دولت پرویز ہے ساقی

درحقیقت فقر و بادشاہت میں کوئی اصولی فرق نہیں ؎

نہیں فقر و سلطنت میں کوئی امتیاز ایسا
یہ سپہ کی تیغ بازی وہ نگہ کی تیغ بازی!

فقیر مست اور آزاد ہوتا ہے ؎

درویش خدا مست، نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہان نہ سمرقند

فقیر کے لئے لازم ہے کہ اس میں شاہانہ جلال و جمال ہو، وہ قوموں کا سردار ہو، وہ حاکم ہو ؎

گو فقر بھی رکھتا ہے انداز ملوکانہ
ناپختہ ہے پرویزی بے سلطنت پرویز

آج کل فقیر و صوفی خانقاہوں میں بیٹھے اللہ ہو، اللہ ہو، کیا کرتے ہیں، وہ دنیا کو دھوکا دیتے اور اپنے ضمیر کو جھٹلاتے ہیں، نہ تو ان کے ہائے و ہو میں کچھ اثر ہوتا ہے اور نہ ان کی نگاہ میں کوئی شوکت و جلال، حالانکہ یہ چیزیں اس کی خاص جوہر ہیں ؎

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی
خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

نہ تخت و تاج میں ہے لشکر و سپاہ میں ہے
جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

فقیر مال و دولت کا مالک نہیں ہوتا ؎

قلندر جز دو حرف لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر ہے قاروں لغت ہائے حجازی کا

فقیر کی نگاہ بہت بلند اور خود بیں ہوتی ہے، اس کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت بھی خوف سے لرزہ براندام ہوتی ہے ؎

نگاہ فقر میں شان سکندری کیا ہے
خراج کی جو گدا ہو وہ قیصری کیا ہے!

فقر کی ایک اعلیٰ مثال حضرت علی کرم اللہ وجہ ہیں، جس شخص میں آپ کی فقیرانہ ادا ہو وہ بادشاہوں کا بادشاہ ہے ؎

دارا و سکندر سے وہ مرد فقیر اولیٰ — ہو جس کی فقیری میں بوئے اسداللٰہی

فقر اور علم میں اقبال نے کیسا سبق آموز اور لطیف فرق دکھلایا ہے، میں چند اشعار نقل کرتا ہوں ؎

فقر کے ہاں معجزات تاج و سریر و سپاہ — فقر ہے میروں کا میر فقر ہے شاہوں کا شاہ

علم کا مقصود ہے پاکیٔ عقل و خرد — فقر کا مقصود ہے عفت قلب و نگاہ

علم فقیہہ و حکیم، فقر مسیح و کلیم، — علم ہے جویائے راہ، فقر ہے دانائے راہ

فقر مقام نظر، علم مقام خبر — فقر میں مستی ثواب، علم میں مستی گناہ

چڑھتی ہے جب فقر کی سان پہ تیغ خودی — ایک سپاہی کی ضرب کرتی ہے کار سپاہ

خودی | فلسفۂ خودی اور بے خودی اقبال کا خاص مضمون ہے، تاریخ فلسفہ میں اقبال نے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالی ہے، اقبال کی بین الاقوامی شہرت کا راز ایک حد تک اس نئے نظام کی بنا ڈالنے میں ہے، اقبال نے اپنی شاعری میں اپنے فلسفے کی مکمل تشریح کی، یہ غزلیں بہت تھوڑی سی ہیں تاہم ان میں خودی پر بعض بہت عمدہ اشعار موجود ہیں، خودی کے صحیح مفہوم کے لئے اس کی نظموں کا مطالعہ ناگزیر ہے، ذیل میں چند منتخب اشعار درج کرتا ہوں ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے — خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

خودی کی شوخی و تندی میں کبر و ناز نہیں — جو ناز ہو بھی تو بے لذت نیاز نہیں،

یہ پیام دے گئی ہے مجھے باد صبح گاہی — کہ خودی کے عارفوں کا ہے مقام پادشاہی

بے ذوق نمود زندگی موت — تعمیر خودی میں ہے خدائی

رائی زور خودی سے پربت — پربت ضعف خودی سے رائی

اس کی خودی ہے ابھی شام و سحر میں اسیر — گردش دوراں کا ہے جس کی زباں پر گلہ

گراں بہا ہے تو بس اک خودی سے ہے ورنہ　　گہر میں آبِ گہر کے سوا کچھ اور نہیں

تعلیمِ عمل | یہ دنیا کا پہلا شاعر ہے جس نے عمل کی اتنے شد و مد سے تلقین کی ہے، اقبال کا نظریہ حیات کوشش پیہم اور عمل مستحکم ہے۔

یہ زمانہ کارزار کا ہے، ایشائی قوموں کو اور خصوصاً ہم مسلمانوں کو لازم ہے کہ عیش و عشرت کا خیال تک چھوڑ دیں، اپنی قومیت کو قایم رکھنے کے لئے، اپنے دین و ایمان کو محفوظ رکھنے کے لئے ضرورت ہے جذبہ عمل اور عمل کی، چنانچہ شاعر کس پُر اثر طریقہ سے کہتا ہے ؎

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے　　شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

اگر موسیٰ کی طرح پھر کوئی نڈر پیدا ہو تو ضرب کلیم بھی دوبارہ پیدا ہو سکتی ہے ؎

مثلِ کلیم ہو اگر معرکہ آزما کوئی　　اب بھی درخت طور سے آتی ہے بانگ لاتخف

جس قوم میں تیمور کی شجاعت اور دلیری نہ ہو زندہ رہنے کی مستحق نہیں ہے ؎

نہ فقر کے لئے موزوں نہ سلطنت کے لئے　　وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

زندگی مستقل حرکت ہے، یہ بذات خود اک محرک شے ہے، یہ سفر میں ہے لیکن اس کی کوئی منزل نہیں ؎

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا یہ تو　　کمال کس کو میسر ہوا ہے بے تگ و دو

ہر اک مقام سے آگے مقام ہے تیرا　　حیات ذوق سفر کے سوا کچھ اور نہیں

ہر شے مسافر ہر چیز راہی　　کیا چاند تارے کیا مرغ و ماہی

اس زمانے کے سیاسی و معاشی مسئلے اس قدر خوفناک اور لاینحل نظر آتے ہیں، لیکن ہم میں کوئی حیدر کرار بھی ہے جو ان کا بہادرانہ مقابلہ کر سکے ؎

بڑھ کے خیبر سے ہیں یہ معرکہ دین و وطن　　اس زمانے میں کوئی حیدر کرار بھی ہے

انسان خواہ کسی ہیئت میں ہو اگر وہ جان توڑ کوشش نہ کرے تو اس کی زندگی کامیاب نہیں ہو سکتی

میری میں فقیری میں شاہی میں غلامی میں   کچھ کام نہیں بنتا بے جرأت رندانہ

سوزِ یقین | جس طرح پیغام عمل اقبال کی شاعری کا ایک بڑا جزو ہے، اسی طرح ایک مسلمان میں سوز یقین کا ہونا شرط اولین ہے، ان دونوں چیزوں کا یکجا پایا جانا ضروری ہے، عرصہ ہوا کہ شاعر نے کہا تھا ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں   جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

اور پھر ؎

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم   جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

اقبال کی عمر کے ساتھ اس کا آرٹ بھی بڑھتا گیا، وہ خیالات جو پہلے دبی زبان سے نکلتے تھے۔ اب نہایت بیباکی سے نکلتے ہیں، اب اس "محفل" میں "دستور زبان بندی" نہیں رہا۔ اُن کی غزلیں تمام خیالات کا مرقع ہیں جو اس کی مشہور نظموں کی زینت ہیں۔

مسلم میں سوز یقین ہو تو شعلہ کی اس کو آنچ تک نہیں لگ سکتی ؎

ہوں آتش نمرود کے شعلوں میں بھی خاموش   میں بندۂ مومن ہوں نہیں دانۂ اسپند،

سوزِ ایمان تمام دنیا کو جلا کر خاک سیاہ کر سکتا ہے اور وہ خس و خاشاک سے دب کر ٹھنڈا نہیں ہو سکتا ؎

وہ چنگاری خس و خاشاک سے کس طرح دب جائے   جسے حق نے کیا ہو نیستاں کے واسطے پیدا

اگر مسلمان میں سوز یقین نہیں تو وہ کافر ہے اور اگر کافر میں یہ چیز ہے تو وہ مومن ہے ؎

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی،   نہ ہو تو مرد مسلماں بھی کافر و زندیق

اس سلسلے میں چند اشعار اور ملاحظہ ہوں:۔

یقیں پیدا کر اے ناداں، یقیں سے ہاتھ آتی ہے   وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری،

تو عرب ہو یا عجم ہو ترا لا الٰہ الا   لغت غریب جب تک ترا دل نہ دے گواہی

متفرق | شاید ہی کوئی شعبہ زندگی ہو جس پر اقبال کی شاعرانہ نظر نہ پڑتی ہو، وہ مسلمانوں کی پژمردگی ان کا زوال، ان کے تمدن کا مٹنا، ان کا غلام رہنا، ان کا ذلیل وخوار ہونا، دیکھ کر کبھی ہنستا ہے کبھی روتا ہے اس نے اپنی زندگی میں اس قوم کو زندہ کرنے کی انتہائی کوشش کی ہے، لیکن افسوس کہ ہم اس کے کلام کی داد دیتے ہیں اس پر عمل نہیں کرتے، بہرحال اس مقام پر میں ناصحانہ انداز نہیں اختیار کر سکتا، یہ محض جملہ معترضہ تھا۔

اقبال کو حیرت ہوتی ہے کہ اس دور میں کوئی آدمی کیوں نہیں پیدا ہوتا حالانکہ، ایران وتبریز، وہاں کی آب وہوا اور وہاں کی سرزمین بخشسہ، ویسی ہی ہے جیسی اس وقت تھی، جس انداز میں شاعر اس افسوس کا اظہار کرتا ہے نہایت پر اثر اور دلکش ہے ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے — وہی آب وگل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

پہلے مصرعے سے کس قدر حسرت ٹپکتی ہے!

ہندوستان میں اورنگ زیب کے عہد میں اسلامی حکومت کا زوال شروع ہو گیا تھا۔ شاعر ذات باری سے التجا کرتا ہے کہ مسلمان کافی ذلیل وخوار ہو چکے اب وقت آپہنچا ہے کہ ہم پر دوبارہ نظر کرم کرے ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند — اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

اقبال نے ایک سچے مسلمان کو ہمیشہ شاہیں سے تشبیہ دی ہے اور یہی تشبیہ اس کے لئے موزوں ہے، محلوں اور عالی شان عمارتوں میں رہ کر عیش وعشرت کرنا اس کی تحقیر ہے ؎

گذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ وبیاباں میں — کہ شاہیں کے لئے ذلت ہے کار آشیاں بندی

نہیں ترا نشیمن قصر سلطانی کے گنبد میں — تو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں پر

آجکل ہمارے سیاسی اور دینی رہنماؤں کا جیسا حال ہے معلوم ہے، کوئی کسی پر یقین نہیں کرتا ہر شخص بدگمان ہے، اس کی ایک بڑی وجہ ہمارا شاعر یوں بتاتا ہے ؎

کوئی کارواں سے ٹوٹا کوئی بدگماں حرم سے کہ امیر کارواں میں نہیں خوئے دل نوازی

پیشوائے قوم میں چند صفات کا پایا جانا ضروری ہے، ؎

نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پُرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

نگاہ مومن کی اقبال نے بڑی تعریف کی ہے، ان غزلوں میں بھی اس کا ذکر بہت آیا ہے مومن کی نظر کی تاب کوئی نہیں لاسکتا، اس کی آنکھوں کو دیکھ کر اس کے دشمنوں کے دل دہل جاتے ہیں ؎

تری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے
کھویا گیا ہے تیرا جذبِ قلندرانہ

اسی طرح مومن کی آواز بھی اتنی بارعب ہوتی ہے کہ اس سے پہاڑوں کے دلوں میں بھی خوف طاری ہوجاتا ہے ؎

سُنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب

اسی طرح ایک دوسرے مقام پر کہتا ہے کہ مومن کی نگاہ سے اتنا رعب طاری ہو کہ شیروں کے بھی حواس جاتے رہیں، مومن بھیڑ بکری کی طرح ڈرا نہیں کرتا، اگر خوف سے اس نے آہ سرد نکالی تو وہ مومن نہیں ؎

نگاہ گرم کہ شیروں کے جس سے ہوش اُڑ جائیں
نہ آہ سرد کہ ہے گوسفندی و میشی

اقبال پان اسلامزم کا بہت بڑا حامی ہے، اس نے زندگی بھر اسلامی اخوت کی تعلیم دی ہے مسلمان کسی خاص ملک کا باشندہ نہیں ہے، اس کی کوئی مخصوص ملکی قومیت نہیں ؎

مومن کا مقام ہر کہیں ہے مومن کے جہاں کی حد نہیں ہے

ترانۂ ملی میں اسی خیال کو اقبال نے کتنے پُرجوش طریقے سے پیش کیا ہے ؎

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا
مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا

بال جبریل میں یہ جوش اور امنگ نہیں ہے، یہاں سنجیدگی ہے، یہاں شاعر شاعر ہی نہیں رہا بلکہ صاحب الہام ہو گیا ہے، آج کل اکثر اسلامی ممالک میں قومی تحریک جاری ہے اور یہ کوشش کی جارہی ہے کہ ایک ملک کے مسلمانوں کو دوسرے اسلامی ممالک سے زیادہ لگاؤ نہ رہے، شاعر اس کے سخت خلاف ہے، لیکن ذرا ملاحظہ کیجئے کہ بجائے رونے دھونے یا غصہ ہونے کے وہ کتنے حسرتناک لہجے میں کہتا ہے ؎

رہے گا راوی و نیل و فرات میں کب تک
ترا سفینہ کہ ہے بحر بیکراں کے لئے

پھر کہتا ہے ؎

تو ابھی رہگذر میں ہے قید مقام سے گذر
مصر و حجاز سے گذر پارس و شام سے گذر

ان مضامین سے سیکڑوں ورق بھرے جا سکتے ہیں۔

مغربی تمدن کی ہجو اس مضمون پر اقبال نے خوب خوب طبع آزمائی کی ہے، یوں تو اکبر الہ آبادی کی کل شاعری کا یہی موضوع رہا مگر اقبال اور اکبر میں بڑا فرق ہے، اکبر نے یورپی تہذیب کا ہنس ہنس کر مذاق اُڑایا ہے اکبر کے کلام میں تمسخر زیادہ اور ادبی طنز کم ہے، شاعر کا مقصد محض لوگوں کو خوش کرنا تھا، اس کے یہ معنی نہیں کہ اس کو مغربی کلچر سے کوئی ہمدردی تھی بلکہ واقعہ یہ تھا کہ وہ اس کے سخت خلاف تھا بایں ہمہ وہ اس نئی تہذیب کے مخصوص معائب کو ان کے اصلی رنگ میں ہمارے سامنے نہ پیش کر سکا۔ اس کے برخلاف اقبال نے بڑی متانت اور دوراندیشی

سے اس چیز کو ہاتھ لگایا۔ اقبال کی شاعری مبہم نہیں اس کے خیالات نہایت سلجھے ہوئے اور مترتب ہوتے ہیں، وہ زبان کے ساتھ اس طرح نہیں کھیلتا کہ اس کی الجھنوں میں پھنس کر اپنا مطلوب و مقصود کھو بیٹھے۔ اکبر اور اقبال میں دوسرا بہت بڑا فرق یہ ہے کہ بسا اوقات اکبر کا منشاء صرف ہجوگوئی ہوتا ہے، فن بجائے خود کوئی چیز نہیں، اقبال کو اس نظریہ شاعری سے سخت نفرت ہے۔ اقبال مغربی زندگی کے ہر پہلو کا جائزہ لیتا ہے لیکن اس کی نظر بہت گہری ہوتی ہے، وہ غوطہ لگاتا ہے تو اس کے ہاتھ موتی لگتے ہیں گھونگھے نہیں، وہ اپنے محاکمات میں محض شاعرانہ حیثیت سے نظر نہیں آتا، وہ فلسفی اور صاحب الہام بھی ہے، وہ کوئی نکتہ مذاق کے لئے نہیں پیش کرتا۔ اکثر تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ہزاروں سال کا انسان ہے جس نے اقوام عالم کی تاریخ خود اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے، اس طویل عمر کے بے شمار تجربات نے اس کا ایک مخصوص نظریہ حیات پیدا کیا ہے اور اس نظریئے کا وہ ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑا ہو کر بڑے زور شور سے اعلان کر رہا ہے، ہم پست نشینوں کو حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے وہ ہمارا ہمدرد اور ہم پر مہربان ہے۔

ہماری قدیم شاعری میں ہجوگوئی ایک مستقل صنف کلام تھی، لیکن موجودہ دور میں یہ چیز بالکل مفقود سی ہو گئی ہے، اس صنف کو غزل سے کوئی رشتہ نہ تھا، یہ اقبال کا زبردست کارنامہ ہے کہ اس نے غزل کی محدود دنیا میں ایک ایسی وسعت کا اضافہ کیا ہے، ذیل میں میں اقبال کی اس مخصوص جدت پر ایک ہلکی سی روشنی ڈالوں گا۔

مغرب و مشرق کی زندگی میں ایک اصولی فرق ہے، مغرب مادیت پرست ہے اور مشرق روحانیت پرست، اس فرق کو اقبال فکر و ذکر کے نام سے یاد کرتا ہے یعنی مغرب فکر کا قایل اور مشرق ذکر کا شیدا۔ کہتا ہے ؎

رگوں میں گردش خوں ہے اگر تو کیا حاصل
حیات سوز جگر کے سوا کچھ اور نہیں

جسے کساد سمجھتے ہیں تاجرانِ فرنگ　　وہ شے متاعِ ہنر کے سوا کچھ اور نہیں

نطشہ جرمنی کا مشہور "مجذوب فلسفی" تھا جو اپنے قلبی واردات کا صحیح اندازہ نہ کرسکا اور اس لئے اسکے فلسفیانہ افکار نے اسے غلط راستہ پر ڈالدیا "نطشہ گویا مغرب کی روحانی و مادی کشمکش کا ایک نمونہ ہے" ایک شعر میں اقبال اُس کی طرف یوں اشارہ کرتا ہے۔

اگر ہوتا وہ مجذوب فرنگی اس زمانے میں　　تو اقبال اس کو سمجھاتا مقامِ کبریا کیا ہے

آج یورپ کی چمک دمک دیکھکر ہماری نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں، ہم مغرب کی ترقی کو انسان تہذیب کا کمال سمجھتے ہیں لیکن شاعر کہتا ہے۔

نہ کر افرنگ کا اندازہ اس کی تابناکی سے　　کہ بجلی کے چراغوں سے ہے اس جوہر کی براقی

اس دور میں فکر مغرب نے زمانہ قدیم کی جادوگری کو پھر زندہ کر دیا ہے اسلئے جس قوم کے پاس عصائے موسیٰ نہ ہو اس عہد میں اس کا گذر مشکل ہے ؎

تازہ پھر دانشِ حاضر نے کیا سحرِ قدیم　　گذر اس عہد میں ممکن نہیں بے چوبِ کلیم

اہل فرنگ کو باوجود ان کی انتہائی کوشش کے روحانی و قلبی مسرت نہ حاصل ہو سکی۔ وہ بیچارے بڑی بے بسی کی حالت میں پڑے ہوئے ہیں اقبال ان کے زخموں پر اس طرح نمک چھڑکتا رہتا ہے ؎

ڈھونڈ رہا ہے فرنگ عیشِ جہاں کا دوام　　وائے تمنائے خام! وائے تمنائے خام!

ایک دوسرے مقام پر شاعر یورپ کی کھوکھلی تہذیب کا اس طرح خاکہ اڑاتا ہے ؎

پیرِ میخانہ یہ کہتا ہے کہ ایوانِ فرنگ　　سست بنیاد بھی ہے آئینہ دیوار بھی ہے

نئی تہذیب سے مشرقی تمدن کو جو نقصان پہنچا ہے اظہر من الشمس ہے اس کی مختصر حقیقت ان لفظوں میں بیان کی گئی ہے ؎

یہی زمانۂ حاضر کی کائنات ہے کیا　　دماغ روشن و دل تیرہ و نگہ بے باک

اس موضوع پر چند اشعار اور ملاحظہ ہوں ؎

یا عقل کی روباہی، یا عشق یداللہی، | یا حیلۂ افرنگی، یا حملۂ ترکانہ،
یہ مدرسے یہ جواں یہ سرور و رعنائی | انھیں کے دم سے ہے میخانۂ فرنگ آباد
مجھکو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی | اس دور کے ملاہیں کیوں ننگِ مسلمانی
گو اس کی خدائی میں مہاجن کا بھی ہے ہاتھ | دنیا تو سمجھتی ہے فرنگی کو خداوند
فردوس جو تیرا ہے کسی نے نہیں دیکھا | افرنگ کا ہر قریہ ہے فردوس کے مانند
دیار کہنا ہے اسکو زخم در کی تیزدستی نے | بہت نیچے سروں میں ہے ابھی یورپ کا واویلا
سوال مے نہ کروں ساقیِ فرنگ سے میں | کہ یہ طریقۂ رندانِ پاکباز نہیں
خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ | سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

فضیلت انسانی اقبال کی بہت سی شاعرانہ خوبیاں دیگر شعرا کے یہاں بھی ہیں فرق اتنا ہے کہ دوسرے شعرا میں سے اکثر رہروانِ منزل ہیں مگر اقبال عین منزل میں ہے۔ لیکن ان سب کے قطع نظر اقبال کی شاعری میں ایک ایسا نکتہ ہے جو میرے خیال میں آج تک شعر و ادب میں نظر نہ آیا تھا۔ عموماً شعرا کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ مخلوقات عالم اور عالم کو فانی کہتے رہے ہیں انھوں نے حیات انسانی کی بے ثباتی اور کم بضاعتی پر اکثر آنسو بہائے ہیں، نہ محض ہمارے شاعروں نے بلکہ ہر ادب اور ہر ملک میں شعرا نے انسان کو نہایت حقیر، بے بس اور کم مایہ کہا ہے، اقبال بھلا شاعر ہے جس نے آدمی کو یاد دلایا کہ تم اشرف المخلوقات ہو، یہ کل کائنات تمہاری ہے، اس کا وجود تمہارے وجود سے وابستہ ہے ؎

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کیلئے

پھر کہتا ہے کہ تو اتنا پست و حقیر نہیں تیرا درجہ بہت بلند ہے، یہ سب تیرے تابع ہیں، یہ چاند و تارے اور یہ آسمان سب تیرے نیچے ہیں

فضا تری مہ و پرویں سے ہے ذرا آگے
قدم اٹھا یہ مقام آسمان سے دور نہیں

یہی نہیں، اقبال دنیا کی ہر شئے کو بہت کمزور اور لاچار سمجھتا ہے۔ اگر کسی چیز کو اللہ نے قوت بخشی ہے تو وہ انسان ہے۔ تمام اعلیٰ مناصب آدمی اور صرف آدمی کے لئے ہیں ؎

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا
مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شاعر کہتا ہے کہ انسان خواہ مخواہ اپنے کو چھوٹا اور بے مایہ سمجھتا ہے، وہ چاند سورج کی بلندی سے سہم جاتا ہے یہ محض اس کی تنگ نظری ہے کیونکہ انسان تو عرش معلیٰ تک پہنچ چکا ہے پھر اس پر اور کس شے کو فضیلت مل سکتی ہے۔

ایک مقام پر اقبال فرشتوں کے سردار کو یوں مخاطب کرتا ہے کہ اے جبرئیل تو انسانوں کی نقل کیا کرتا ہے، اس کی جذب و مستی تجھ میں کہاں سما سکتی ہے۔ فرشتوں میں یہ تاب کہاں تو اپنی خاموشی میں بیٹھے ہوئے اللہ اللہ کئے جائیں ؎

نہ کر تقلید اے جبریل میرے جذب و مستی کی
تن آساں عرشیوں کو ذکر و تسبیح و طواف اولیٰ

ایک دوسری جگہ وہ اللہ تعالیٰ سے بڑی شوخی سے کہتا ہے کہ تو فرشتوں پر کیوں اس قدر نازاں ہے، ذوق و شوق یہ کیا جانیں، ناز و نیاز یہ کیا سمجھیں ؎

مقام شوق ترے قدسیوں کے بس کا نہیں
انہیں کا کام ہے یہ جن کے حوصلے ہیں زیاد

اقبال کی بڑی خوبی یہ کہ وہ ایک ہی معنی کو ہزار طرح سے پیش کرتا ہے اور ہر مرتبہ نیا انداز اس کی ہر ادا دلفریب و دلکش ہوتی ہے، دیکھئے اسی تخیل یعنی ہستی انسانی کا اعلیٰ مرتبت

کو وہ کیسے اچھوتے رنگ میں پیش کرتا ہے ؎

عروجِ آدمِ خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہِ کامل نہ بن جائے

یہ اجرامِ فلکی انسان کے حاسد معلوم ہوتے ہیں، اس شعر میں علم نجوم کی طرف شاید کچھ اشارہ کیا جاتا ہے کہ ستاروں کی حرکت تاریخ عالم سے وابستہ ہے، مگر شاعر کے نزدیک یہ اور ہی چیز ہے۔ ستارے صرف بغض و عناد کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ تمدن انسانی کا تمام دار و مدار ان کی حرکت پر منحصر ہے، مگر ان کو معلوم ہے کہ انسان کی منزل سب منزلوں سے بالاتر ہے اس لئے وہ بہت خوف کھائے ہوئے ہیں، ستاروں کے خوف کا اظہار ان کے ٹوٹنے سے ہو سکتا ہے۔

آدمی کی فضیلت کا کمال یہ ہے کہ دنیا کی ہر شے اس بات کی منتظر ہے کہ انسان پھر اپنی کھوئی ہوئی منزل پر پہنچے تاکہ اس کے صدقے میں ان چیزوں کی بھی کچھ قدر ہو ؎

عروجِ آدمیِ خاکی کے منتظر ہیں تمام
یہ کہکشاں یہ ستارے یہ نیلگوں افلاک

اقبال کو اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ انسان خدا کا حقیقی نائب ہے، وہ اس کا عزیز ہے، اس کا راز داں ہے، اس کا محبوب ہے، چنانچہ وہ اللہ تعالیٰ سے شکایتہً عرض کرتا ہے ؎

تو نے یہ کیا غضب کیا مجھ کو بھی فاش کر دیا
میں ہی تو ایک راز تھا سینۂ کائنات میں

آپٹیمزم یا رجائیت امید اور اولوالعزمی کی تعلیم اقبال کے خاص موضوع شاعری ہیں، تاریخ ادب عالم میں بیشک ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ شعرا نے ملک کی سیاسیات کو بدل دیا ہے یا قوموں اور شخصوں کی ذہنیتیں تبدیل کر دی ہیں، مگر ایسی شاعری ہمیشہ وقتی رہی ہے بائرن کی چائلڈ ہیرولڈ (Child Harold) کو پڑھ کر اس وقت کوئی یورپین جہاد پر نہیں آمادہ

ہو سکتا رودکی کے قصیدے کی آج کل صرف ادبی اہمیت رہ گئی ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ اس کے برخلاف اقبال قدم قدم پر ہم سے کہتا ہے کہ بڑھے چلو تمہاری راہ میں کوئی روڑا نہیں، یہ زمین و آسمان کیا چیز ہیں تم تو لامکاں تک پہونچ سکتے ہو؎

نوا سے سیر مکاں لامکاں سے دور نہیں
وہ جلوہ گاہ ترے خاکداں سے دور نہیں

ہماری دنیا پرانی ہو چکی ہے، اس کی چیزوں کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں تھک گئی ہیں، شاعر التجا کرتا ہے کہ اے خدا اب تو مجھ کو ایک نئی دنیا دے جس کو تو نے ابھی ابھی خلق کیا ہو؎

پرانے ہیں یہ ستارے فلک بھی فرسودہ
جہاں وہ چاہیئے مجھ کو کہ ہو ابھی نوخیز

شاعر ایک جگہ پہلے بھی کہہ چکا ہے کہ کل موجودات عالم انسان ہی کے لئے ہے؛ اس لئے اس کو چاہیئے کہ فطرت کے رموز کو سمجھے اور اس کو اپنے کام میں لائے؎

فطرت کو خرد کے روبرو کر، تسخیر مقام رنگ وبو کر

بزم قدرت میں انسان نے بڑی عجیب وغریب چیزیں دیکھی ہیں جن پر وہ اکثر بے خبر ہو جاتا ہے، پھر بھی فطرت میں بہت سی باتوں کی کمی رہ گئی ہے، شاعر کہتا ہے اے انسان تو خدا کی قدرت کا شاہکار ہے اس لئے تو ان کمیوں کو پورا کر؎

بے ذوق نہیں اگرچہ فطرت جو اس سے نہ ہو سکا وہ تو کر

انسان کو اولو العزمی اور بلند پروازی کی تعلیم یوں دیتا ہے؎

تاروں کی فضا ہے بیکرانہ تو بھی یہ مقام آرزو کر

انسان اپنی تقدیر کا تابع نہیں، وہ بے وقوف ہیں جو اس جال میں پھنسے ہوئے ہیں؎

تقدیر شکن قوت باقی ہے ابھی اس میں ناداں جسے کہتے ہیں تقدیر کا زندانی

ہر شخص اپنی تقدیر خود تعمیر کر سکتا ہے، شرط محض یہ ہے کہ وہ اپنی خودی کو بلند کرے ؎

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے   خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ دنیا میں آج تک کسی شاعر کو ایسے کلمے کہنے کی جرأت نہ ہوئی ہوگی
اقبال اقوام ایشیا کو اکثر مخاطب کرتا ہے، ان کی پژمردگی پر وہ اس طرح آنسو بہاتا ہے ؎

دلوں میں ولولے آفاق گیری کے نہیں اٹھتے
نگاہوں میں اگر پیدا نہ ہو انداز آفاقی

لیکن پھر وہ ہم کو اس طرح امید دلا کر خوش کرتا ہے ؎

وہ مرغزار کہ بیم خزاں نہیں جس میں،
غمیں نہ ہو کہ ترے آشیاں سے دور نہیں،

کیوں؟ اس لئے کہ ؎

تو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا   ترے سامنے آسماں اور بھی ہیں،
اسی روز و شب ہی الجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں،

متفرق | اس مقالے کے شروع میں میں نے کہا تھا کہ اقبال کی غزلوں میں حسن و عشق اور ہجر و وصال کی داستانیں کم ہیں اور ہیں بھی تو وہ عشقیہ شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہیں جس کی ہمارے ادب میں کوئی مثال نہیں ملتی۔ اقبال حقایق زندگی کے ہر پہلو پر گہری نظر ڈالتا ہے۔ لیکن یہ نظر صرف فلسفیانہ نہیں ہوتی، بلکہ یہ شعر کے دلکش لوازمات میں پنہاں ہوتی ہے، اقبال کی غزل کے بہت سے مضامین تو میں گنا چکا ہوں، چند متفرق خیالات اور دیکھ لیجئے۔

اشتراکیت کے علمبردار اخوت اور مساوات کی تعلیم کو اپنا مذہب سمجھتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ حکومت مزدوروں کے ہاتھ میں ہونی چاہئیے کیونکہ ملک کے تمام لوگ انھیں کی مشقت و محنت پر جیتے ہیں، لیکن ہمارا شاعر کہتا ہے کہ یہ بالکل غلط نظریہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مزدوروں

کے ہاتھ اگر حکومت آجائے تو وہ سرمایہ داروں کی ظالمانہ حرکتوں کو اپنا لائحہ عمل بنالیں، خود ان کو وہی طریقہ کار اختیار کرنے میں ذرا بھی تامل نہ ہو جس کو مذموم کہتے ہیں ؎

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

دین و سیاست دو جدا چیزیں نہیں بلکہ حیات انسانی کے دو مختلف نظام ہیں انکا آپسمیں جدا رہنا دونوں کے لئے مہلک ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ اگر حکومت مذہب کی بندشوں سے آزاد ہو جائے تو وہ خونخواری اور چنگیزی ہو کر رہ جاتی ہے، موجودہ یورپ اس کی بہترین مثال ہے چنانچہ اقبال کہتا ہے ؎

جلال پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

اپنی نظموں میں ایک مقام پر اس مسئلہ کو اس طرح پیش کرتا ہے ؎

دوئی ملک و دیں کے لئے نامرادی دوئی چشم تہذیب کی نابصیری

اقبال طنزیات کا بہت بڑا ماہر ہے اس صنف کلام کی اسکے یہاں فراوانی ہے، اس مقام پر ایک ہلکی سی جھلک دیکھ لیجئے۔ اقبال کہتا ہے کہ ہاں میں نے بھی سنا ہے کہ ترک بڑے ہوشمند اور سمجھدار ہیں مغرب کی تقلید کو انھوں نے اپنا شیوہ بنالیا ہے۔ لیکن آہ میں ان نادان ترکوں کو کیسے سمجھاؤں کہ وہ سراسر دھوکے میں ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے کہ اقبال اس چیز کو کتنے شرح و بسط کے ساتھ کتنے لطف انگیز پیرائے میں کہتا ہے ؎

سنا ہے میں نے سخن رس ہے ترک عثمانی سنائے کون اسے اقبال کا یہ شعر غریب
سمجھ رہے ہیں وہ یورپ کو ہم جوار اپنا ستارے جن کے نشیمن سے ہیں زیادہ قریب

اقبال کا مستقبل بہت امید افزا ہے رہ رہ کر اس کے دل میں ولولے اٹھتے ہیں کہ مسلمان پھر

کیوں نہیں جہاں بانی کرتا، وہ پھر کیوں نہیں "خسرو اقلیم دل" ہوتا، اس میں وہ جذب و مستی پھر کیوں نہیں پیدا ہوتی جس کی وجہ سے اس کے اسلاف نے زمین و آسمان پر حکومت کی تھی۔ اس کیف کے عالم کا وہ اس طرح ترجمہ کرتا ہے ؎

عجب نہیں کہ مسلماں کو پھر عطا کر دیں -
شکوہ سنجر و فقر جنید و بسطامی -

اقبال کا غلامی کا تخیل دیکھئے کس قدر انوکھا اور صحیح ہے ؎

غلامی کیا ہے ذوق حسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے ہیں وہی زیبا

اور پھر سنئیے کہ غلاموں کی ذہنیت کو کس قدر ذلیل سمجھتا ہے ؎

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردان حر کی آنکھ ہے بینا

ملوکیت اور شہنشاہیت تہذیب انسانی کے لئے سخت مضر ہے، جب اس طرز حکومت کا دور دورہ ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی مخلوق پر ناراض ہو کر انھیں میں سے دو چار کو منتخب کر کے اس کام پر مامور کرتا ہے کہ وہ اپنے ہی بھائی بندوں کو ایسی سزا دیں کہ وہ بھی یاد رکھیں، اس نکتے میں اقبال کی سیاسی باریک بینی ملاحظہ کیجئے ؎

کرتی ہے ملوکیت آثار جنوں پیدا
اللہ کے نشتر ہیں تیمور ہو یا چنگیز

گاندھی جی نے چاہا تھا کہ وہ فاقہ کر کے ہندو مذہب سے ذات پات اور چھوت چھات کو نکال دیں، لیکن افسوس کہ ان کی چال کارگر نہیں ہوئی، برہمن ان کے ہاتھ نہ آنا تھا نہ آیا کیونکہ طلسم سامری کو عصائے موسیٰ ہی توڑ سکتا ہے ۔

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

ایک جگہ مسئلہ آواگون پر اقبال اس طرح روشنی ڈالتا ہے ــــ اے خدا اگر انسانوں کو تو اسی واسطے پیدا کرتا ہے کہ وہ بار بار جیتے مرتے رہیں تو مجھ کو بتا کہ اس میں فائدہ کیا ہے ؎

ہو نقش اگر باطل تکرار سے کیا حاصل
کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان دوبارہ نہیں پیدا ہوتا، مرنے کے بعد انسان کو زندگی دوام ملتی ہے اور اس کی روح حالت سفر میں ہوتی ہے، یہ دنیا اس سفر کی منزل اولیں ہے ؎

خودی کی یہ ہے منزل اولیں   مسافر! یہ تیرا نشیمن نہیں!

امام رازی بہت مشہور مفسر قرآن گذرے ہیں ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ باوجود اس کے کہ انھوں نے قرآن پاک کے باریک نکتوں کو اس خوبی سے سمجھا، اور سمجھایا لیکن اُن کے دلائل عقلی ضعف یقین کا مداوا ممکن نہیں چنانچہ شاعر کا تجربہ ہے کہ ؎

علاج ضعف یقیں ان سے ہو نہیں سکتا   غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہائے دقیق

۱۹۳۱ء میں اقبال نے اسلامی ممالک کی سیاحت کی تھی، دوران سفر میں اس نے بعض بے بہا نظمیں لکھی ہیں، اقبال خود پوچھتا ہے کہ آخر مجھ میں جوانی کی اُمنگیں اور جوش وخروش پھر کیسے عود کر آئے، پھر خود ہی جواب دیتا ہے کہ شاید قرطبہ کی آب وہوا کا اثر ہے (شاعر نے سیاحت کا کافی حصہ ہسپانیہ میں گذارا تھا جہاں اس نے آثار اسلامیہ کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔)

ہوائے قرطبہ شاید یہ ہے اثر تیرا
مری نوا میں ہے سوز و سرور عہد شباب

نمونے کے لئے یہ چند اشعار جو اوپر آچکے ہیں کافی ہیں، اصحاب ذوق وسخن شناس بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اقبال کا اصل موضوع شاعری کیا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے ایک چیز اور پیش کرونگا اور پھر مضمون ختم ہے۔

اقبال کا تغزل تغزل کے معنی میں یہ سمجھتا ہوں کہ شعر میں سوز و گداز ہو، حلاوت ہو، چاشنی ہو۔ بجائے دماغ کے دل کو اپیل کرے پڑھنے والے کو ایک انبساط حاصل ہو، اس کے قلب کو حرکت ہو دیگر الفاظ میں وہ تمام خوبیاں جو ایک غزل میں ہونی چاہییں، تغزل غزل میں بھی ہو سکتا ہے اور نظم میں بھی اقبال کی شاعری میں اس کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔ فصاحت و بلاغت، معنی آفرینی ندرت خیال و ندرت ادا اور موسیقی تو تقریباً ہر صنف شاعری کی جان ہیں۔

سوز و گداز

میری نوائے شوق سے شور حریم ذات میں
غلغلہ ہائے الاماں بتکدۂ صفات میں

پہلے تو آپ اس عشق حقیقی کی داد دیجئے۔ عاشق کے نالوں سے کون و مکان گونج اٹھتے ہیں، یہاں تک کہ عرش بھی ہل گیا ہے، شعر میں ایک طرف تو آرزو کی ولولہ انگیزی اور دوسری جانب اس آرزو کے اظہار کا اثر، میرے خیال میں شاید ہی کوئی صاحب ذوق ہوگا جس پر اس شعر کو سن کر والہانہ کیفیت نہ طاری ہو جائے۔ زبان کی پاکیزگی بھی تخیل کی بلندی سے مطابقت کرتی ہے شاعر کہتا ہے کہ اے خدا! اگر دنیا کی چالیں ٹیڑھی ہیں اور آسمان گردش میں ہے تو مجھ کو اس کی کیا فکر ہے۔ ہے تو سب تیرا ہی کیا دہرا ؎

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا
مجھے فکر جہاں کیوں ہو! جہاں تیرا ہے یا میرا

طرز ادا ملاحظہ کیجئے، کس قدر شیریں اور دلچسپ ہے پھول کی تھوڑی سی زندگی کا دردناک نوحہ صرف ایک شعر میں سنئے ؎

ٹھہر سکا نہ ہوائے چمن میں خیمۂ گل
یہی ہے فصل بہاری؟ یہی ہے باد مراد؟

شاعر کی التجا میں اس کی انتہائے شوق اور اس کی بیقراری ملاحظہ ہو ؎

کر مجھکو پہلے زندگی جاوداں عطا
پھر ذوق و شوق دیکھ دل بیقرار کا

کا نشاوہ دے کہ جسکی کھٹک لازوال ہو
یارب وہ درد جسکی کسک لازوال ہو

ایک جگہ سوز و ساز کے ساتھ شوخی اور پرواز خیال دیکھئے ؎

نہ کردیں مجھکو مجبور نوا فردوس میں حوریں
مرا سوز دروں پھر گرمی محفل نہ بن جائے

دوسرے عاشق اپنے مرض کے بڑھنے کی دعا کرتے ہیں، یا دیوانے اور مجنون ہوکر صحرا و بیابان میں نکل جاتے ہیں، اقبال کے یہاں یہ رنگ نہیں۔ عاشق اپنا علاج خود تجویز کرتا ہے ؎

وہی دیرینہ بیماری! وہی نامحکمی دل کی
علاج اس کا وہی آب نشاط انگیز ہے ساقی

لیکن ذیل کے شعر میں دیکھئے کہ شاعر کس طرح رو رو کر کہتا ہے ؎

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی!

انسان کسقدر لاچار ہوجاتا ہے جب قدرت اسے مجبور کردیتی ہے شاعر اللہ تعالیٰ سے نہایت پردرد لہجے میں شکوہ کرتا ہے ؎

ترے آزاد بندوں کی نہ یہ دنیا نہ وہ دنیا
یہاں مرنے کی پابندی، وہاں جینے کی پابندی

شاعر کی دلیل کس قدر انوکھی ہے!

شاعر ہر حال میں راضی بہ رضائے الٰہی ہے، اس کو زمانے سے شکایت نہیں ؎

تری بندہ پروری سے مرے دن گذر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایت زمانہ!

اقبال کی شاعری میں ایک معرکۃ الآرا نکتہ ہے کہ ذاتی اغراض کی بنا پر اس نے کبھی زمانے کا رونا نہیں رویا۔

مضمون طویل ہوا جاتا ہے، اس لئے اس ذیل میں چند منتخب شعر پیش کرکے اس موضوع کو ختم کرتا ہوں ؎

اے مسلماں اپنے دل سے پوچھ، ملا سے نہ پوچھ
ہوگیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم

وہ سجدہ، روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی،
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

سنی نہ مصر و فلسطیں میں وہ اذاں میں نے
دیا تھا جس نے پہاڑوں کو رعشہ سیماب

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

تو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر | مری دانش ہے افرنگی، مرا ایماں ہے زناری

دل بینا بھی کر خدا سے طلب | آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

علم میں بھی سرور ہے لیکن | یہ وہ جنت ہے جس میں حور نہیں

کیا غضب ہے کہ اس زمانے میں | ایک بھی صاحب سرور نہیں

ناصبوری ہے زندگی دل کی | آہ وہ دل کہ ناصبور نہیں

ہر گہر نے صدف کو توڑ دیا | تو ہی آمادہ ظہور نہیں،

ارنی میں بھی کہہ رہا ہوں مگر | یہ حدیث کلیم و طور نہیں

فلک نے انکو عطا کی ہے خواجگی کہ جنھیں | خبر نہیں روش بندہ پروری کیا ہے

نشان راہ دکھاتے تھے جو ستاروں کو | ترس گئے ہیں کسی مرد راہ داں کیلئے

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا | کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

دنیائے دوں کی کب تک غلامی | یا راہبی کر یا پادشاہی،

یہ پچھلے پہر کا زرد رو چاند | بے راز و نیاز آشنائی،

تیری قندیل ہے ترا دل | تو آپ ہے اپنی روشنائی،

نوائے صبحگاہی نے جگر خوں کر دیا میرا | خدایا جس خطا کی یہ سزا ہے وہ خطا کیا ہے

دیا اقبال نے ہندی مسلمانوں کو سوز اپنا | یہ اک مرد تن آساں تھا تن آسانوں کے کام آیا

وہ اپنے حسن کی مستی سے ہیں مجبور پیدائی | مری آنکھوں کی بینائی میں ہیں اسباب مستوری

یہ تھوڑے سے اشعار نمونے کے لئے کافی ہیں، اقبال کا رنگ تغزل بذات خود ایک اتنا زبردست مضمون ہے کہ دو چار الفاظ میں اسکی تشریح نہیں ہو سکتی، انشاء اللہ کبھی موقعہ ملا تو موضوع پر مفصل بحث ہوگی۔

~ اس سلسلے میں اقبال کے اسلوب (اسٹائل) پر چند الفاظ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

اقبال کا طرز بہت زیادہ شگفتہ اور دلکش ہوتا ہے، جس طرح وہ اپنی نظموں میں ایک ہی خیال کا بار بار اعادہ کرتا ہے غزلوں میں بھی اس کا یہی حال ہے، لیکن ہر مرتبہ نئی شان سے نئے آن بان سے بعض مرتبہ اس کے شعر ایسے پھڑکتے ہوئے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا اس کے کیف میں بالکل گم ہو جاتا ہے، اور کبھی تو صرف ایک مصرع ہی ایسا سانچے سے ڈھلا نکلتا ہے کہ اسے ہزار بار دہرائیے اور ہر بار آپ کو ایک نیا لطف حاصل ہوگا، ایک نیا تجربہ ہوگا، مثلاً۔

میں تجھ کو بتاتا ہوں تقدیر امم کیا ہے — شمشیر و سناں اول طاؤس و رباب آخر

معلوم ہوتا ہے کہ ہمالیہ کی چوٹی پر کھڑی ہو کر کوئی بلند ہستی ہم کو یہ حقیقت بتلا رہی ہے پہلے مصرع پر غور کیجئے، تعجب ہوتا ہے کہ شاعر کی زبان سے یہ الفاظ کیسے نکلے ہوں گے۔ دوسری مثال۔

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے — وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اس شعر میں بھی پہلا مصرع لاجواب ہے، معلوم ہوتا ہے کہ ہم خود شاعر کی زبان سے سن رہے ہیں تبریز اور رومی کی تصویریں فوراً ہمارے سامنے آجاتی ہیں تیسری مثال:۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن

جس بے لوث محبت سے شاعر یہ خیال ظاہر کرتا ہے اس کا اصلی نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جاتا ہے۔ چوتھی مثال ؎

کو شگاف تیری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب — تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گذر

اس شعر کو ایک بار پڑھکر آپ ہرگز لطف اندوز نہیں ہو سکتے، شعر خود مجبور کرتا ہے کہ آپ اسے بار بار پڑھئے اور محظوظ ہوجیئے۔ یہ شاعر کا کمال ہے۔

رنگ تغزل کے سلسلے میں آخری چیز موسیقی ہے۔ خواہ غزل ہو خواہ نظم ہو اقبال کے ہر شعر میں موسیقیت کی روح موجود ہے، یہ سب کو معلوم ہے اب تک اقبال اپنے اشعار ادبی مجلسوں میں نہایت ترنم اور خوش الحانی سے پڑھا کرتا تھا، لیکن ہر شاعر اپنا کلام ترنم سے

پڑھ سکتا ہے اس میں ترنم ہو یا نہ ہو، بہر حال اس میں ذرا شبہ نہیں کہ اقبال کی شاعری سراسر موسیقی ہے، اگر اردو اور فارسی میں اتنی موسیقی کسی کے کلام میں ملتی ہے تو وہ صرف حافظ کا کلام ہے اقبال کو اپنے اس کمال کا خود احساس ہے، چنانچہ کہتا ہے ؎

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں — کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی!

ایک دوسرے مقام پر وہ اپنی قدردانی یوں کرتا ہے ؎

فقیرِ راہ کو بخشے گئے اسرارِ سلطانی — بہا میری نوا کی دولتِ پرویز ہے ساقی

میں اور مثالیں نہیں پیش کرتا صرف دو غزلوں سے چند اشعار درج کرتا ہوں جن کے ہر ہر لفظ میں نغمہ ہے سرود ہے ؎

پھر چراغِ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن — مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مرغِ چمن

حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے — ہوں اگر شہروں سے بن پیارے تو شہر اچھے کہ بن!

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی — تو اگر میرا نہیں بنتا نہ بن اپنا تو بن!

من کی دنیا! من کی دنیا سوز و مستی جذب و شوق — تن کی دنیا! تن کی دنیا سود و سودا مکر و فن!

من کی دولت ہاتھ آتی ہے تو پھر جاتی نہیں — تن کی دولت چھاؤں ہے آتا ہے دھن جاتا ہے دھن

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

اپنی جولاں گاہ زیرِ آسماں سمجھا تھا میں — آب و گل کے کھیل کو اپنا جہاں سمجھا تھا میں

بے حجابی سے تری ٹوٹا نگاہوں کا طلسم — اک ردائے نیلگوں کو آسماں سمجھا تھا میں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا — مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام — اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

کہہ گئیں رازِ محبت پردہ دارِ ہائے شوق — تھی فغاں وہ بھی جسے ضبطِ فغاں سمجھا تھا میں

عرصہ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی — داورِ محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں
تھی کسی درماندہ رہرو کی صدائے دردناک — جس کو آوازِ رحیلِ کارواں سمجھا تھا میں

حضرات اقبال کی غزل کے متعلق اور بہت کچھ کہنا تھا مگر وقت کی تنگی اور مضمون کی طوالت کے خوف سے اسی پر اکتفا کرتا ہوں جو کچھ میں نے آپ کے سامنے ابھی پیش کیا ہے۔ یہ مضمون بالکل نامکمل ہے تاہم اخیر میں یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اقبال کی غزلوں سے اُردو ادب میں ایک نئے اور بہت شاندار دور کا آغاز ہوا ہے۔ اس وقت اگر ہم یورپ کی ر (Lyrical Poetry) یعنی عشقیہ شاعری کے مقابلے میں اُردو سے کوئی چیز پیش کر سکتے ہیں تو وہ یہی اقبال کی غزلیں ہیں! یہ ممکن ہے کہ اس زمانے میں لوگ اقبال کی اس کوشش کی داد نہ دے سکیں شاعر بہرحال اس کا محتاج نہیں، وہ خود کہتا ہے ؎

میری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی
کہ بانگ صورِ سرافیل دل نواز نہیں

اس لئے ؎

اثر کرے نہ کرے سن تو لے مری فریاد
نہیں ہے داد کا طالب یہ بندۂ آزاد

اقبال کے کلام میں عشق کا تخیّل

(از جناب ضیاء احمد صاحب ایم۔ اے بدایونی لکچرار شعبہ فارسیہ نگران علی گڑھ میگزین)

عشق کے بارے میں اس قدر لکھا گیا ہے کہ اب اس پر کسی معتد بہ اضافے کی گنجائش نہیں معلوم ہوتی اہل لغت کہتے ہیں عشق دوستی میں حد سے گذر جانے یا محبوب کے عیوب کا احساس جاتے رہنے کا نام ہے اُن میں سے بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ عشقہ (عشق پیچاں) سے ماخوذ ہے جو ایک بیل ہے کہ شروع میں سبز ہوتی ہے اور آخر میں پتلی اور زرد پڑ جاتی ہے۔ چونکہ عشق کا آغاز و انجام بھی اسی قبیل سے ہے اسلئے اُس کو اس نام سے موسوم کیا گیا۔ ماہرین لسانیات نے دل لگاؤ کے مختلف مدارج بتائے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ محبت کا ابتدائی درجہ ہَویٰ ہے، پھر علاقہ پھر کلَف۔ پھر عشق اُس کے بعد شَعَف۔ پھر شَغَف۔ پھر جویٰ۔ پھر تیَم۔ پھر تدلیہ اور سب سے آخر ہُیَم۔ سیم المبا کا قول ہے کہ عشق ایک وسوسہ یا جنون کی قسم کا مرض ہے جو حسین صورت کے دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ حضرات صوفیہ کی تحقیق ہے کہ العشقُ نارٌ تحرقُ ما سوا المحبوب یعنی عشق ایک آگ ہے جو ماسوا کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ بجز معشوق کوئی باقی نہیں رہتا۔ شعرا کا فیصلہ ہے کہ

به عالم هر کجا درد و دلے بود   بهم کردند و عشقش نام کردند

غرض جتنے منہ اُتنی ہی باتیں۔ ہمارے شعرا خصوصاً اساتذہ فارسی نے جذبہ عشق کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے اور عشق کی لطیف اور نازک واردات کو جن نادر پیرایوں میں ادا کیا ہے اُن کے بیان کے لئے ایک دفتر چاہیئے اور اگرچہ عموماً اُن کے کلام میں عشق کے متعلق کوئی واضح مفصل اور مربوط بیان تلاش کرنا بے سود ہوگا تاہم جس قدر وہ لکھ گئے ہیں وہ اُن کی قادر الکلامی کی برہا

محکم ہے۔ اِس جگہ اُس کا استقصا نہ مطلوب ہے نہ مناسب۔ ہمارا مقصد صرف اِس قدر ہے کہ علامہ اقبال نے اپنے کلام اور پیام میں عشق کا جو تخیّل پیش کیا ہے اُس کی وضاحت کی جائے۔ اور اُس کے مختلف پہلوؤں پر حتی الوسع روشنی ڈالی جائے۔

حضرت اقبال بین الاقوامی حیثیت کے مفکّر اور شاعر ہیں۔ اس لئے خیال ہو سکتا ہے کہ اُن کے بارے میں کچھ لکھنا اُن کا نہیں۔ بلکہ اپنا عیارِ سخن ظاہر کرنا ہے۔

مادحِ خورشید مدّاحِ خود است　　　　که دو چشمم روشن و نامرمد است

لیکن در اصل اِس بحث پر اظہار خیالات کا مدّعا صرف حضرت موصوف کی بارگاہ کمال میں اپنا خراج عقیدت پیش کرنا ہے۔ چو غلامِ آفتابم ہمہ ز آفتاب گویم۔

اقبال کی شاعری نے جو پیغام زندگی امّت مسلمہ کو دیا ہے اُس کے نسبت صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ یہ رفعت افکار۔ یہ متانت خیالات اور یہ صدق جذبات آج عرب و عجم دونوں کے کلام میں مفقود ہے۔ جیسا کہ ہر بڑے مصلح اور ہر بڑے شاعر کا خاصہ ہے کہ اُس کے یہاں ایک مرکزی خیال ہوتا ہے جس کے گرد تمام افکار گردش کرتے ہیں اسی طرح اقبال کی تعلیمات کا محور خودی ہے خودی کا مسئلہ بذات خود تفصیل طلب ہے۔ مگر یہاں اتنا سمجھ لینا کافی ہے کہ اقبال کے نزدیک اظہار خودی کا مفہوم یہ ہے کہ نفس انسانی کی مرکزی قوتوں کو معطل نہ چھوڑ دیا جائے۔ بلکہ کسی بلند مقصد کے ماتحت بہ احسن طریق بر روئے کار لایا جائے۔ خودی کے بعد اُنھوں نے جس چیز پر شاید سب سے زیادہ زور دیا ہے وہ عشق ہے۔ عشق کیا ہے؟ آؤ دیکھیں وہ خود اُس کی کیا تفسیر کرتے ہیں۔

عشق وہ جذبہ کامل ہے جو خودی کی صلاحیتوں کو آشکار کرتا۔ اُن کو صحیح راہ پر لگاتا اور استواری بخشتا ہے۔ اقبال فرماتے ہیں ؎

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است　　　　زیرِ خاکِ ما شرارِ زندگی است
از محبت می شود پاینده تر　　　　زنده تر سوزنده تر تابنده تر

از مجت اشتعالِ جوہرش | ارتقائے ممکناتِ مضمرش
فطرتِ او آتش اندوز از عشق | عالم افروزی بیاموز از عشق
عاشقی آموز و محبوبے طلب | چشمِ نوحے قلبِ ایوبے طلب
شمع خود را ہمچو رومیؔ برفروز | روم را در آتشِ تبریز سوز،

انسان کو چاہئیے کہ کسی کا ہو کر رہے۔ اگر دل میں تڑپ اور طبیعت میں گداز نہیں تو انسانیت کاملہ کے مقام تک رسائی معلوم۔

×مولوی ہرگز نہ شد مولائے روم | تا غلامِ شمسِ تبریزی نہ شد

ظاہر ہے کہ خودی کے بیدار ہونے کے اعتبار سے سکندر اور چنگیز۔ تیمور اور نپولین بھی بلند درجہ رکھتے تھے۔ مگر عشق کی دولت سے محروم تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اُن کی خودی راہ راست سے ہٹ کر غلط رستے پر پڑ گئی تھی۔ اِن لوگوں نے کل دنیا میں اپنے عظمت کا تہلکہ ڈالدیا تھا اور اپنے کارناموں سے عالم کو متزلزل کر دیا تھا۔ مگر آج کتنے ہیں جو ان کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ ان کے برخلاف عاشق (کہ مومن کامل کا دوسرا نام ہے) اسی لئے پیدا ہوا ہے کہ قلوب پر حکمرانی کرے اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجْعَلُ لَھُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا (جو لوگ ایمان لائے اور اُنھوں نے نیک عمل بھی کئے خدائے رحمٰن عنقریب اُن کی محبت لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دے گا) یہ کیوں؟ اسلئے کہ وہ کسی سے صلح کرے یا لڑائی۔ دوستی رکھے یا دشمنی۔ ہر صورت میں اُسے رضائے محبوب مدنظر ہوتی ہے۔ وہ اگر "زجاج دوست" کو توڑتا بھی ہے تو "سنگ دوست" سے

جنگِ شاہانِ جہاں غارتگری ست | جنگِ مومن سنّتِ پیغمبری است
جنگِ مومن چیست ہجرت سوئے دوست | ترکِ عالم اختیارِ کوئے دوست

دراصل یہی "ہجرت سوئے دوست" کا راز ہے جو آیۂ قرآنی اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ میں مضمر ہے۔ (حضرت ابراہیم نے اپنے باپ اور اپنی قوم کے لوگوں سے کہا تھا اِنَّنِیْ الخ

...... یعنی جن بتوں کی تم پرستش کرتے ہو مجکو اُن سے کچھ سروکار نہیں مجھے تو اُس خدا ہی سے سروکار رہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے)۔

جس طرح عشق کے بغیر خودی، خود بینی اور خود سری کی مترادف ہو جاتی ہے اسی طرح اُس کے بغیر علم، جہالت اور ضلالت کا ہمسر ٹھہرتا ہے۔ یہی نکتہ ہے جس کو عارف روم نے اپنے انداز میں نہایت دلنشیں پیرایہ میں بیان کیا ہے۔

علم ہائے اہلِ دل حمّالِ شان علم ہائے اہلِ تن احمالِ شاں
علم چوں بر دل زنی یارے شود علم چوں بر تن زنی بارے شود

اقبال کا طریقِ ادا بھی کچھ کم دلکش نہیں۔

علم بے عشق است از طاغوتیاں علم با عشق است از لاہوتیاں
علم را بے سوزِ دل خوانی شر است نورِ او تاریکیٔ بحر و بر است
علم ترساں از جلالِ کائنات عشق غرق اندر جمالِ کائنات
بے محبت علم و حکمت مردہٗ عقل تیرے بر ہدف ناخوردہٗ

دوسری جگہ ارشاد کرتے ہیں۔

علم در اندیشہ می گیرد مقام عشق را کاشانہ قلبِ لاینام
علم تا از عشق برخوردار نیست جز تماشا خانۂ افکار نیست،
ایں تماشا خانہ سحرِ سامری است علم بے روح القدس افسونگری است

موجودہ علوم کے متعلق حضرت اقبال کا فتویٰ سنئے اور داد دیجئے، حقیقت یہ ہے کہ بلندیٔ جذبات اور زورِ بیان کے لحاظ سے اُن کے کلام کو وہ مرتبہ حاصل ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کے لٹریچر میں بھی اُس کی مثالیں کم یاب ہیں۔

سوزِ عشق از دانشِ حاضر مجوے کیفِ حق از جامِ ایں کافر مجوے

مدتے محوِ تگ و دو بودہ ام — راز دانِ دانشِ نو بودہ ام
دانشِ حاضر حجابِ اکبر است — بت پرست و بت فروش و بتگر است
پا بزندانِ مظاہر بستۂ — از حدودِ حس بروں ناجستۂ

دانش حاضر کی اس سے جامع تعریف خیال میں نہیں آتی۔ بت پرست و بت فروش و بتگر است۔ اقبال نے اکثر "عقل" کو "عشق" کے ناکام حریف کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور دونوں کا موازنہ کرنے میں وہ کمال دکھایا ہے کہ ایک طرف روح ایماں تازہ ہوتی ہے اور دوسری طرف ذوق شعر وجد کرتا ہے کہتے ہیں۔

عقل در پیچاکِ اسباب و علل — عشق چوگاں بازِ میدانِ عمل
عشق صید از زورِ بازو افگند — عقل مکار است و دامے می زند
عقل را سرمایہ از بیم و شک است — عشق را عزم و یقیں لاینفک است
آں کند تعمیر تا ویراں کند — ایں کند ویراں کہ آباداں کند
عقل محکم از اساسِ چوں و چند — عشق عریاں از لباسِ چوں و چند
عقل میگوید کہ خود را پیش کن — عشق گوید امتحانِ خویش کن

اور سنئے اور لطف اٹھائیے۔

فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد — کہ میرِ قافلہ و ذوقِ رہزنی دارد
نشانِ راہ ز عقلِ ہزار حیلہ مپرس — بیا کہ عشق کمالے ز یک فنی دارد

دیگر۔ از من اے بادِ صبا گوے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است
برق را ایں بجگر می زند آں رام کند — عشق از عقلِ فسوں پیشہ جگر دار تر است

دیگر زمانہ عقل کو سمجھا ہوا ہے مشعل راہ — کسے خبر کہ جنوں بھی ہے صاحبِ ادراک

ایضاً بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق — عقل ہے محوِ تماشائے لبِ بام ابھی

یہ عشق و عقل۔ صداقت و مصلحت۔ حق و باطل۔ نور و ظلمت کی آویزش کچھ دور حاضر سے مخصوص نہیں۔ بلکہ سچ پوچھئے تو ابراہیمؑ اور نمرود۔ موسیٰؑ اور فرعون۔ محمدؐ اور ابوجہل کی منازعت بھی اسی کا کرشمہ تھی۔ عہد سعادت کے بعد واقعہ کربلا اس آویزش کی نمایاں ترین مثال ہے۔ ظاہر بیں نگاہیں حسینؓ اور یزید کے معاملے کو اس زاویہ سے دیکھتی ہیں کہ ایک طرف ایک باجبروت بادشاہ ہے جس کی مدد پر فوجیں ہیں خزانے ہیں اور تمام وہ ساز و سامان شوکت ظاہری ہے جس کو استبداد خرید کر میدان میں لاسکتا ہے۔ دوسری طرف ایک بے سرو سامان ہستی ہے جس کے پاس "نہ لشکرے نہ سپاہے نہ کثرت الناسے"۔ دونوں کی جنگ کا نتیجہ قدرتاً اول الذکر کی فتح پر منتج ہوتا ہے۔ اور بس۔ لیکن غور کیجئے اس سے بڑھ کر بے بصیرتی اور کیا ہوگی۔ دراصل حق و باطل کی اس جنگ میں حقیقی اور دائمی فتح حسینؓ ہی کے ہاتھ رہی جنہوں نے اپنا سب کچھ عشق میں لٹا کر حیات جاودانی پائی۔ اور اُن کے مقابلہ میں یزید اور اس کے رفقاء کے حصے میں عارضی کامرانی کے باوجود ابدی ذلت و لعنت آئی۔

موسیٰؑ و فرعون و شبیرؓ و یزید — ایں دو قوت از حیات آمد پدید
زندہ حق از قوت شبیریؓ است — باطل آخر داغ حسرت میری است
چوں خلافت[عہ] رشتہ از قرآں گسیخت — حریت را زہر اندر کام ریخت
خاست آں سر جلوۂ خیر الامم — چوں سحاب قبلہ باراں در قدم
برزمین کربلا بارید و رفت — لالہ در ویرانہ ہا کارید و رفت
تا قیامت قطع استبداد کرد — موج خون او چمن ایجاد کرد
رمز قرآں از حسینؓ آموختیم — ز آتش او شعلہ ہا اندوختیم

عہ ملاحظہ ہو شرح عقائد نسفی وغیرہ۔

عہ الخلافت بعدی ثلثون سنتہ الخ (الحدیث)

اس سے ثابت ہو گیا کہ اگرچہ عشق حیات ابد کا ضامن ہے تاہم کشمکش اور قربانی کے بغیر اُس کے جوہر نہیں کھلتے۔

عشق با دشوار ورزیدن خوش است　　چوں خلیلؑ از شعلہ گل چیدن خوش است
ممکنات قوتِ مردانِ کار،　　گردد از مشکل پسندی آشکار،

ممکن ہے کسی کو یہ گمان ہو کہ اقبال علم اور عقل کو انسانی ترقی کے لئے غیر ضروری بلکہ مضر سمجھتے ہیں یہ خیال صحیح نہیں۔ اُن کا مقصد صرف یہ ہے کہ اگر علم کے ساتھ ذوق وحرارت کی کمی ہے تو وہ علم ناقص ہے۔

یا مردہ ہے یا نزع کی حالت میں گرفتار　　جو فلسفہ لکھا نہ گیا خون جگر سے

اہل فرنگ کی علمی کوششیں اور عقل کاوشیں کس پر مخفی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ نرے علم وعقل سے تو ایمان ویقین کی منزل تک پہونچنا دشوار ہے۔

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا۔ زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا۔ یہاں غیر مناسب نہ ہوگا اگر عشق وعقل کے بارے میں مرشد روم کی رائے درج کر دی جائے۔ جن کے روحانی فیضان کا اقبال نے نہایت بلند آہنگی سے ہر جگہ اعتراف کیا ہے۔ مولانا کا ارشاد ملاحظہ ہو۔ حق یہ ہے کہ عشق کی تعریف میں اس سے موثر تر پیرایہ خیال میں نہیں آسکتا۔

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما　　اے طبیبِ جملہ علتہائے ما
اے دوائے نخوت وناموس ما　　اے تو افلاطون وجالینوس ما

عشق پھولوں کی سیج نہیں بلکہ کانٹوں کا بستر ہے۔

عشق در اول چرا خونی بود،　　تا گریزد ہر کہ بیرونی بود
تو بیک خواری گریزانی ز عشق　　تو بجز نامے نمیدانی ز عشق،
عشق را صد ناز واستکبار ہست　　عشق با صد ناز می آید بدست

عشق و ناموس اے برادر راست نیست | بر درِ ناموس اے عاشق مایست[1]

عقل کی نسبت بھی مولانا کا فیصلہ وہی ہے جو آپ اقبال کے یہاں پڑھ چکے ہیں۔ البتہ مولانا نے اس جگہ تفریق و تفصیل سے کام لیا ہے۔ یعنی اُن کے نزدیک عقل کی دو قسمیں ہیں۔ عقل جزوی اور عقلِ کلی۔ عقل جزوی (ناقص) یا بہ الفاظ دیگر عقل معاش عشق سے محروم ہوتی اور اسباب ظاہر پر تکیہ کرتی ہے عقل کلی (کامل) یا عقل معاد اس کے بالکل برعکس ہے۔ ایک سرتا سر بحث و استدلال۔ ظن و تخمین۔ نفاق اور مصلحت اندیشی کی خوگر ہے۔ دوسری فکر و ذکر۔ یقین و ایمان۔ صداقت و حق پرستی کی۔ ایک اہل دنیا کے حصّے میں آئی ہے۔ دوسری اہل اللہ کے۔

عقلِ جزوی را وزیر خود مگیر | عقل کل را ساز اے سلطاں وزیر
عقلِ جزوی عقل را بدنام کرد | کامِ دنیا مرد را بے کام کرد
عقلِ جزوی عشق را منکر بود | گرچہ بنماید کہ صاحب سِر بود
گر بہ استدلال کارِ دیں بدے | فخر رازی راز دارِ دیں بدے
پائے استدلالیاں چوبیں بود | پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

یہ تو ایک طرح کا جملہ معترضہ تھا۔ اب ہم پھر علامہ اقبال کے کلام کی طرف آتے ہیں۔ مگر اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس عشق کا جس پر اقبال نے اس قدر زور دیا ہے مطلوب کون ہے۔ اس کا جواب خود اقبال ہی کے کلام سے ہم کو ملتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

مستِ چشمِ ساقئ بطحاستیم | در جہاں مثلِ مے و میناستیم
شورِ عشقش در نئے خاموشِ من | می تپد صد نغمہ در آغوشِ من
من چہ گویم از تولّایش کہ چیست | خشک چوبے در فراقِ او گریست[2]

---

[1] [2] اُستن حنّانہ کا واقعہ۔

ابرِ آذار است و من بستانِ او ۔۔۔ تاکِ من نمناک از بارانِ او

چشم در کشتِ محبت کاشتم ۔۔۔ از تماشا حاصلے برداشتم

خاکِ یثرب از دو عالم خوشتر است ۔۔۔ اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

دل بہ محبوبِ حجازی بستہ ایم ۔۔۔ زیں جہت با یکدگر پیوستہ ایم

رشتۂ ما یک تولّایش بس است ۔۔۔ چشم ما را کیفِ صہبایش بس است

عشقِ او سرمایۂ جمعیت است ۔۔۔ ہمچو خوں اندر عروقِ ملت است

فی الحقیقت عشق محمد (صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ہی مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کے مرض کی دوا ہو سکتا ہے اور یہی رشتہ اُن کے منتشر شیرازہ کو پھر یکجا کر سکتا ہے۔

ایک جگہ سرورِ عالم سے مخاطب ہو کر استغاثہ کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اشعار میں سوز و بے تابی کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔

ذکرِ تو سرمایۂ ذوق و سرور ۔۔۔ قوم را دارد بہ فقر اندر غیور

اے مقام و منزلِ ہر راہرو ۔۔۔ جذبِ تو اندر دلِ ہر راہرو

سازِ ما بے صوت گردید آنچناں ۔۔۔ زخمہ بر رگ ہائے او آید گراں

در عجم گردیدم و ہم در عرب ۔۔۔ مصطفیٰ نایاب و ارزاں بولہب

مومن و از رمزِ مرگ آگاہ نیست ۔۔۔ در دلش لا غالب الا اللہ نیست

اقبال نے ایک کامل نبّاض کی طرح ہمارے مرض انتشار و افتراق کی صحیح تشخیص کی اور اُس کے لئے دوا بھی تیر بہدف تجویز فرمائی یعنی عشق رسولؐ لیکن وہ اسی پر بس نہیں کرتے بلکہ ایک ہمدرد طبیب کی مانند "پرچہ ترکیب استعمال" بھی عنایت کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

کیفیت ہا خیزد از صہبائے عشق ۔۔۔ ہست ہم تقلید از اسمائے عشق

کاملِ بسطام در تقلید فرد | اجتناب از خوردنِ خربوزہ کرد[1]
عاشقی؟ محکم شو از تقلیدِ یار | تا کمندِ تو شود یزداں شکار[2]

ایمان کی بات تو یہ ہے کہ مسلم کی دینی اور دنیاوی رفعت کے لئے اس سے بہتر لائحہ عمل کوئی پیش نہیں کر سکتا۔ ملت اسلام میں افراط و تفریط سے جو مفاسد راہ پا گئے ہیں کسی سے مخفی نہیں۔ پھر کیونکر ممکن تھا کہ اقبال سا دیدہ ور اس موقع پر تنبیہ کے فرض سے غفلت کرتا۔ مسلمانوں میں کچھ لوگ ہیں جو محبت میں غلو روا رکھتے اور اتباع میں کوتاہی کرتے ہیں۔ دوسرے اتباع میں تشدد برتتے مگر محبت سے تہی دامن نظر آتے ہیں۔ دراصل یہ دونوں راہیں کعبے کی بجائے۔ ترکستان کی طرف لیجاتی ہیں۔ مسلمان کا فرض ہے کہ ایک طرف حقیقت محمدیہ کو جو محبوبیت مطلقہ کا مظہر اتم ہے اپنے مال باپ۔ اولاد اور تمام جہان سے عزیز سمجھے اور دوسری طرف آپکے اسوۂ حسنہ کو اپنی زندگی کے ہر ہر لمحے میں شمع راہ بنائے۔ اِنَّ المُحِبَّ لِمَن یُحِبُّ مُطِیعٌ[3] ورنہ ظاہر ہے کہ محبت بے اتباع منافقانہ غلو ٹھہرے گی اور اتباع بے محبت خشک تقشف۔

بیانات و اقتباسات بالا سے (جن میں بخوف طوالت استقصاء کی کوشش نہیں کی گئی ہے) صاف ظاہر ہے کہ علامہ اقبال کے نزدیک مسلمانوں کی انفرادی و اجتماعی ترقیوں کا کفیل اور نیابت الٰہی کے منصب رفیع پر فائز ہونیکی سبیل اگر کوئی ہے تو وہ عشق ہے جس کے بغیر مسلمان مسلمان ہی نہیں۔

طبع مسلم از محبت قاہر است
مسلم ار عاشق نباشد کافر است

---

[1] حضرت بایزید بسطامی کے خربزہ نہ کھانے کا واقعہ۔ [2] یہ الفاظ و تراکیب قواعد کے لحاظ سے نہیں بلکہ "ادب" کے اعتبار سے مزید کھٹکتی ہیں۔ مگر۔ وانکہ ایں پیمانۂ معنی بود۔ گنذمش بستاں کہ پیمانہ است رد۔ [3] دیکھو حدیث

نذرِ اقبال

جناب مولانا سید علی احسن صاحب احسن مارہروی
لکچرار شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

اے ادیبِ خوش بیاں اے شاعرِ شیریں زباں
تیرے سوز و ساز سے معمور ہے سارا جہاں

تیری میٹھی بات ہے ایران کی شاخِ نبات
طوطیِ شیراز جس کی مدح میں رطب اللساں

عودِ ہندی بن کے پھیلی تیرے نغموں کی صدا
تو ہے شاگردِ رشیدِ بلبلِ ہندوستاں

معرفت کا فلسفہ سیکھا ہے پیرِ روم سے
اور فصیح الملک سے پایا فصاحت کا نشاں

ساحری ہے شاعری تیری کہ ہے پیغمبری
ہے طلسمِ معنوی میں جس کے اعجازِ بیاں

تیری تصنیفات ہیں آئینہ بردارِ کمال
جن سے جوہر تیرے مثلِ روزِ روشن ہیں عیاں

کر دیا وہ راز اسرارِ خودی نے منکشف
نفس کی عزت بڑھی جس سے، بنا دل نکتہ داں

ہیں رموزِ بے خودی میں وہ کنائے ورشگاف
غفلتوں نے کر دیا تھا جن کو پردے میں نہاں

ہے زبورِ فارسی تشریحِ اسرار و رموز
جس نے کھولی ہیں سراسر معرفت کی گتھیاں

کی عطا جاوید نامے نے حیاتِ سرمدی
سلسلہ جس کا زمیں سے چل کے ہے تا آسماں

ہے پیامِ مشرق ایسا کارنامہ جس کے بعد
بن گئی مجذوب کی بڑ گوئٹے کی داستاں

نیل ڈالے جس نے سینوں میں وہ ہے ضربِ کلیم
جس سے ہر فرعونِ بے ساماں کا دل ہے نیم جاں

نام جس مجموعے کا مشہور ہے بانگِ درا
اُس نے چونکا یا جہاں کو کارواں در کارواں

اور اک تصنیفِ اُردو یعنی بالِ جبرئیل
اُس کا شہبازِ تخیل عرش پر ہے پرفشاں

علم کی دنیا میں حاصل ہے قبولِ عام انھیں
مستفیض و مستفید ان سے ہیں سب خورد و کلاں

قصہ کوتہ تیرے ارشادات و ملفوظات نے
اہلِ حکمت میں بڑھا دی آبروئے شاعراں

ورنہ تھی یہ شاعروں کی قدر و عزت ملک میں
ہو کوئی احسن تو اُس پر بھی ہوا کذب کا گماں

زندہ باد اے مصلحِ آئینِ حکمت زندہ باد
دی حیاتِ تازہ تو نے اے مسیحائے زماں

اور کیا کہئے کہ روشن تر ترا احوال ہے
تو بلند اقبال و خوش اقبال ہے اقبال ہے

قوم کی بنیاد
اقبال اور قوم کا تخیل

محمد اللیث صدیقی بدایونی
بی۔ اے۔ آنرز (علیگ)
ایڈیٹر

میگزین کا اقبال نمبر طباعت کے لئے پریس بھیجا جا چکا تھا کہ ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو علامہ موصوف کے فلسفۂ وطن سے گہرا تعلق رکھتا ہے، مولوی حسین احمد صاحب دیوبندی نے جو اپنے سیاسی معتقدات کی بنا پر کانگریسی کہے جاتے ہیں دہلی میں ایک تقریر کے دوران میں فرمایا کہ قومیں مذہب سے نہیں وطن سے بنا کرتی ہیں بالفاظ دیگر وطنیت کا تخیل قوم کی تعمیر میں مذہب کے تخیل پر فوقیت رکھتا ہے۔

علامہ موصوف وطنیت کے اس ڈھونگ سے ہمیشہ بیزار رہے ہیں۔ یورپ جانے سے پیشتر بیشک وہ اپنے کو ہندی کہتے تھے اور اُن کا وہ ترانہ۔

ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

عام طور پر مشہور ہے۔

لیکن یورپ میں اُنھوں نے اس وطنیت کے ہاتھوں مذہب اور انسانیت کے خرقہ دیرینہ کو چاک ہوتے دیکھا، اہل یورپ نے وطنیت کی آڑ پکڑ کر خود غرضی کو مطمحِ نظر بنایا اور دوسروں کو اپنے لئے لقمۂ تر جانا، اس کی تازہ ترین مثال اطالیہ اور حبش کی جنگ ہے۔ اطالیہ کو اپنے فرزندوں کے لئے نوآبادیات کی ضرورت تھی اور وہ اپنی بڑھتی ہوئی قوتوں کا کہیں نہ کہیں امتحان کرنا چاہتی تھی، مسولینی نے حبش کو تاکا اور اپنی تمام قوت صرف کر کے ابی سینیا کی صدیوں کی آزادی کو فنا کر دیا اور بین الاقوامی جمعیت مشاورتی جلسے ہمدردی کے ریزولوشن اور اپنی ناراضگی کا اظہار ہی کرتی رہ گئی۔

ادھر جاپان نے اسی اصول کو پیش نظر رکھکر چین پر دست درازی شروع کی اور جو مادی اور روحانی فیض اس نے یورپ سے حاصل کیا تھا اس کا اظہار کر دیا، یعنی مسولینی کے نقش قدم پر چل کر اس نے بھی اعلان کر دیا کہ اپنی بڑھتی طاقت کو جاپان کہیں نہ کہیں صرف کرنا چاہتا ہے، اور چونکہ

چین اس قدر قوت کا مالک نہیں جو اس سیل بے پناہ کو روک سکے لہذا اس کو فنا ہو جانا چاہیئے۔اس سے غرض نہیں کہ کتنی بیگناہ جانیں اس مہیب دیوتا کی نذر ہو جائینگی، کتنی مجبور عورتیں بیوہ اور کتنے معصوم بچے یتیم اور لاوارث رہ جائینگے، نہ اس سے کچھ مطلب کہ سرسبز اور شاداب کھیت ویران اور بنجر بن جائینگے آبادیاں بن ہو نگی اور جہاں انسانوں کے دم سے رونق ہے وہاں بوم اور شغال کا گذر ہوگا، نہ اس کی پرواہ کہ چین جو دنیا میں تہذیب کا سب سے پرانا خادم اور پہلا علمبردار ہے اور جس نے ہمیشہ مرنج مرنجان کی پالیسی پر عمل کیا ہے اس قابل ہے کہ اطمینان اور سکون سے اپنی قوتوں کی شیرازہ بندی کر کے عصر حاضر سے ہم آہنگ ہو سکے۔

بہرحال وطنیت کے صدقے میں انسانوں نے پھر درندگی اور خونخواری کا درس لیا، اسلام جو سلامتی اور امن کا مذہب ہے، وطن کے اس تخیل سے اختلاف کرتا ہے۔ اسلام ایک عالمگیری اخوت کا قایل ہے جس میں ہندی اور ایرانی، ترکی اور خراسانی، چینی اور عربی کا کوئی فرق اور امتیاز نہیں رہتا، جس چیز کو لیگ آف نیشن آج حاصل کرنے کی سعی کر رہی ہے۔ اسلام اُس کا نمونہ اب سے تیرہ سو سال پہلے پیش کر چکا ہے[۱]

ہندی مسلمان بھی عرصہ تک اس پرکار بند رہے، لیکن اپنے دور زوال میں وہ بھی زمانے کی رو کے ساتھ بہ گئے کانگریس نے اپنی کامیابی کے لئے مسلمانوں کے اشتراک عمل کو ناگزیر سمجھا، لیکن وہ مسلمانوں کی علیحدہ جماعتی حیثیت تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں، مسلمانوں کو یہ خطرہ ہے اور یہ خطرہ بے بنیاد بھی نہیں کہ کانگریس میں اور خود ملک میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، اگر اس وقت انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت کو قایم نہ رکھا تو پھر ان کی زندگی اس ملک میں دشوار ہو جائیگی اور وہ اکثریت سے مغلوب اور مرعوب ہو کر اسی میں مدغم ہو جائینگے۔

---

[۱] ملاحظہ ہو علامہ موصوف کا گرامی نامہ مسئلہ جہاد پر۔

مسلمانوں کو شامل کرنے کے لئے کانگریس نے بارہا کوشش کی اور اب سے چند سال پہلے یہ کوشش کامیاب بھی رہی سنہ ۱۹۲۰ء و سنہ ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے دوش بدوش بڑی سے بڑی مالی اور جانی قربانی کر کے کانگریس کو اپنے خون سے سینچا اور اُس کا حاصل جو کچھ مسلمانوں کو ملا وہ یہ کہ جب کانگریس نے اپنی غلط فہمی سے خود کو برسراقتدار سمجھا تو مسلمانوں کی جماعتی حیثیت سے منکر ہو گئی اور مہاتما گاندھی جو کبھی خالص ہندوستانی تھے اب کُھلم کُھلا مہاسبھائی بن بیٹھے، کانگریس نے تحریراً اور تقریراً تو وعدہ یہ کیا تھا کہ کانگریس فرقہ وارانہ رنگ کبھی اختیار نہ کرے گی۔ لیکن مہاتما گاندھی نے جب ہندوستان کو ہندو اور مسلمانوں کی متفقہ قربانی سے جنگ آزادی کے لئے تیار کرالیا تو اپنی ظاہری نقاب کو اُلٹ کر اصلی روپ میں آ گئے اور اچھوت ادھار اور دوسرے ذرائع سے خالص مہاسبھائی ذہنیت کا اعلان کرنے لگے۔

لطف تو یہ ہے کہ مہاتما جی کانگریس کے چار آنے والے بھی ممبر نہیں لیکن کانگریس کی گاڑی جس میں مسلمانوں کو صرف بیل بنا کر جوتنے کی کوشش ہو رہی ہے مہاتما جی کے اشارے بغیر ایک قدم آگے نہیں چلتی اور وہ لیڈر بھی جو انقلابی، اشتراکی اور سب کچھ کہلاتے ہیں۔ مہاتما جی کے آگے کان نہیں ہلا سکتے اور ان کی تمام انتہا پسندی پانی ہو جاتی ہے۔ کانگریس کے پنڈال میں شان و شوکت اور ہنگامہ آرائی تو بہت کچھ ہوتی ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو مہاتما کا ارشاد ہوتا ہے۔

یہ ایک چیز اپنی جگہ مستقل ہے، اب آگے چلئے، زبان کے مسئلہ میں کانگریس نے "ہندوستانی" کو ہندوستان کی قومی اور ملکی زبان سمجھا ہے اور اپنے دستور میں اسے تسلیم کیا ہے، رسم الخط کے معاملہ میں ناگری اور فارسی دونوں کو قابل قبول کہکر بظاہر بڑی رواداری کا ثبوت دیا ہے۔

لیکن یہی ہندوستانی کانگریس کے گرو گھنٹال پنڈت موہن داس کرم چند گاندھی کی صدارت میں "ہندی اتھوا ہندوستانی" کی قلابازی کھا کر اردو سے دور اور ہندی کے

قریب جا پڑتی ہے، ناگپور والا ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ابھی لوگوں کو بھولا نہ ہوگا کہ مولوی عبدالحق نے جو اُردو کو بھی اس سرزمین پر زندہ رہنے کا حق دیکر ہندوؤں سے کٹھ ملا کا خطاب لینا چاہتے ہیں اس پر بہت کچھ واویلا کیا اور خود کانگریس کے صدر کو متوجہ کرنا چاہا لیکن چوروں کے صلاح کار گٹھ کٹے ہوتے ہیں انھوں نے اس نازک مسئلہ پر اپنی اظہار رائے کو نامناسب سمجھا۔

اُردو کو مسلمانوں کے سر زبردستی ڈالا جا رہا ہے، اُس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد اُردو بولتی اور سمجھتی ہے، لیکن گاندھی جی کو اس پر اعتراض یہ ہے کہ قرآنی حروف میں لکھی جانے والی زبان کیسے ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے، مسلمان تو بیچارے پہلے سے ہی ڈشٹ اور پاپی تھے اس زبان پر بھی جو اسی ملک کی پیداوار ہے اور ہندو مسلمانوں کے باہمی ربط و ارتباط سے ظہور میں آئی نزلہ گرنا شروع ہوا۔

یہ کہہ لیجئے کہ کانگریس کو اصولاً ساہتیہ سمیلن سے کوئی علاقہ نہیں لیکن اہل نظر سے یہ پوشیدہ نہیں کہ یہ صرف لفظی ہیر پھیر ہے حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کی۔ اس کا تازہ ترین ثبوت یہ ہے کہ ہری پورہ میں جو کانگریس کا سالانہ اجلاس ہوا اور اس سلسلہ میں نمائش کا بھی انتظام کیا گیا تو تمام اشتہارات اور اشیائے متعلقہ میں دیوناگری اور گجراتی رسم الخط نظر آتا تھا، یہ بیان خود کانگریس کے طرفدار "مدینہ" اخبار کا ہے جو پچھلے یو۔ پی اسمبلی کے الکشن میں اپنی وفاداری کا حلف اُٹھا چکا ہے۔

ان چیزوں سے قطع نظر کیجئے اور خالص سیاسی معاملات پر آجایئے کانگریس نے سات صوبوں میں اکثریت حاصل کرلی اور وزارت قبول کرنے کا مرحلہ درپیش ہوا، پہلے کانگریس اسمبلی اور کونسل کے انتخاب میں حصہ لینا اپنے مفاد کے لئے مضر سمجھتی تھی، لیکن جب یہ سمجھا کہ حکومت کا دست راست بنکر زیادہ قوت اور شوکت حاصل ہوگی تو اپنے اصول کو شکست کرکے برطانوی اقتدار اور استبداد کی معاون بن بیٹھی اور موقع ملا تو کرسی وزارت پر بھی جم گئی۔

یو-پی میں ایک بزرگ جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوئے تھے اور لیگ کی کوششوں سے کامیاب ہوئے تھے، وزارت قبول کر کے اس جماعت سے علیحدہ ہو گئے اور کانگریس میں غیر مشروط شرکت قبول کر لی، جب مسلمانوں نے زیادہ لے دے کی تو اسمبلی کی ممبری سے استعفیٰ دیدیا، لیکن وزارت پر قائم رہ کر دوبارہ انتخاب کے میدان میں اُتر آئے۔

اس انتخاب میں کانگریس نے جو اوچھے ہتھیار استعمال کئے اُن کا ذکر ہمارے موضوع سے باہر ہے تاہم کامیابی ان کے ہاتھ رہی اور وقتی طور پر کانگریس کی کھلم کھلا فتح نے یہ ثابت کر دیا کہ مسلمانوں کو اس پر اعتماد ہے۔

لیکن بعد کے ضمنی انتخابات میں پانسہ بالکل اُلٹ گیا اور مسلم لیگ نے اپنی پے بہ پے فتح سے ثابت کر دیا کہ مسلمانوں میں ابھی دم باقی ہے اور وہ اپنی حفاظت سے غافل ضرور ہو گئے تھے لیکن طاقت ان میں باقی تھی اور باقی ہے۔

ان ہنگاموں نے ایک نہایت اہم مسئلہ غور و فکر کے لئے پیش کر دیا ہے کانگریس والے کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی اس ملک میں کوئی جماعتی حیثیت ہو یا نہ ہو، کانگریس میں وہ صرف ہندوستانی بنکر شامل ہو سکتے ہیں، مذہب کا خرقہ دیرینہ پہن کر اسمیں داخل ہونا دشوار ہے۔ مسلمانوں کا ایمان ہے کہ وہ سب سے پہلے مسلمان ہیں اور پھر کچھ اور۔ کانگریسی بزرگ کہتے ہیں کہ قوم کا تخیل وطن پر تعمیر ہوتا ہے، مسلمان اس کی بنیاد اپنے مذہب پر سمجھتے ہیں۔

چنانچہ دہلی میں حسین احمد صاحب کی تقریر کا بھی لب لباب یہی تھا۔ علامہ اقبال نے اس کو سنکر ایک قطعہ لکھا۔ اس کی مخالفت اور موافقت میں جو قطعات نکلے وہ ذیل میں پیش کرتا ہوں۔

قطعہ

(علامہ ڈاکٹر سر محمدؐ اقبال)

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ زدیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است چہ بیخبر ز مقام محمد عربی ﷺ است

بمصطفیٰ ﷺ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست

اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

قطعہ

(از جناب محمد اصلح صاحب الحسینی انصاری)

حکیم مشرق و در دام سوقیاں افتاد — بہ سوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است
مگر ز سرّ اذا جاء کفر بنود آگاہ — چہ بے خبر ز رموز شریعت عربی است
کفی لہ کذبا ان یقول ما سمعہ — بگفتہ اند چنیں ہم ز گفتہ ہائے نبی است
حدیث دامن یزدان و چاک را چہ لقب — چو امثال محمد عیار بولہبی است
مقام خویش ندانند و طعنہائے خطیب — ادب نگاہ ندارند ایں چہ بیخردی است

بہ ذروۂ کہ زند بال فکر قوالے
اثر گزاشتہ ہائے مہاجر مدنی است

قطعہ

(از جناب شوکت صاحب سبزواری ایم - اے)

چو با خبر نہ ز اسرار ملت بیضا — ترا رسد کہ شناسی محمد عربی
شگفت نیست اگر شاعری نمی داند — مقام مطلبی از مقام بولہبی
ہر آنکہ نقش گر لفظ و غافل از معنی — زبان طعن کشاید چرا بہ بے ادبی
بہ بزم خلوتیاں پا بنہ کہ جا اینجاست — ادا شناس نہ دلبرا خطا اینجاست

قطعہ

(از علامہ شمس الحق شیخ المعقول دیوبند)

نظام قوم بدو گوند می شود پیدا — اگر ہنوز ندانی کمال بولہبی است
نظام ملت واحد بہ اختلاف بلاد — تو وام گیر از جذب محمد عربی است
نظام دوم کہ قائم میان صد ملل است — نظام وحدت ملکی ست ایں چہ بوالعجبی است

قطعہ

(از جناب اقبال احمد صاحب سہیل)

کسے کہ خردہ گرفت است بر حسین احمد
زبان او عجمی و کلام در عربی است

کہ گفت بر سر منبر کہ ملت از وطن است
دروغ گوئی و ایراد ایں چہ بوالعجبی است

درست گفت محدث کہ قوم از وطن است
کہ مستفاد ز فرمودہ خدا و نبی است

زبان طعن کشودی مگر نہ دانستی،
کہ فرق ملت و قوم از لطائف ادبی است

تفاوتیست فراواں میانِ ملت و قوم
یکے ز کیش و دگر کشوری است یا نسبی است

بہ ملت ارچہ براہیمی است سرور ما
ولے بہ قوم حجازی بہ نسل مطلبی است

ز قوم خویش شمرد اہل کفر را احمد
رسولؐ پاک کہ نامش محمد عربی است

خدائے گفت بہ قرآں بِکُلِّ قومٍ هادٍ
مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است

بہ قوم خویش خطابِ پیمبراں بنگر
پر از حکایت یقوم مصحف عربی است

بلند تر بود از قوم رتبۂ ملت
کہ حبلِ دیں قوی تر ز رشتۂ نسبی است

کسے کہ ملتِ اسلام نور سینۂ اوست
برادر است اگر زنگی است ور حلبی است

مگر بہ ہموطناں در جہاد استخلاص
مجاہدانہ تعاون ز روئے حق طلبی است

سلوکِ رفق و مدارا بہ جارِ ذی القربی
عمل بہ حکم الٰہی و اتباع نبی است

محبت وطن است از شعائر ایماں
ہمیں حدیث پیمبر فدیتہ یابی است

نظر نہ بودن و با دیدہ ور درافتادن
دو گونہ شیوۂ بوجہلی است و بولہبی است

رموزِ حکمتِ ایماں ز فلسفی جستن
تلاش لذت عرفاں ز بادۂ عنبی است

خموشی از سخن نا سزا گزیدہ تر است
کہ ہرزہ لاف زدن خیرگی و بے ادبی است

بہ دیوبند گرا . گر نجات می طلبی
کہ دیو نفس سلحشور و دانش تو صبی است

بگیر راهِ حسین احمد از خدا خواہی
که نائب است نبی را و ہم ز آلِ نبی است

قطعه

از جناب سبطین احمد صاحب بی۔ اے۔ بی۔ ٹی (علیگ)

عجب که اہلِ بصیرت ہنوز بے خبر اند — چه فتنه ہا پس تفریق قومی و نسبی است
تفاوتیست گر فہم میانِ ملّت و قوم — یکے ز رنگ و وطن دیگر از خدا طلبی است
یکے به باد دہد وحدتِ بنی آدم، — که نسل این ز صفاہان و اصل آن حلبی است
دگر یگانه شمارد صہیب و سلمان را، — نسنجد این که فلاں اعجمی است یا عربی است
بجا است این که ز باطل جہاد در رہِ حق — شعارِ مسلم و فرمودۂ خدا و نبی است
تعاونے به حلیفے به کارِ خیر و حسن — ہم آیتے است که وارد به مصحفِ عربی است
ولے ز قوم و وطن بتکده بنا کردن — ز شیوه ہائے ابوجہلی و ابولہبی است
ز اشتراکِ وطن گر بنا کنی قومے — بغیر وحدتِ فکر و عمل چه بوالعجبی است
دگر بخواہی که خیزد ز ہند نسلِ جدید — به اختلاطِ شعائر ہمیں زیاں طلبی است
به مدرسه نه بری زینہار شعرِ حکیم — که کارِ مدرسه تعلیلِ لغوی و ادبی است

ملّت و قوم

(از جناب غلام سجاد صاحب بسمل)

تو اے کہ کذب شمردی کلام صاحب دل
نگاہ تو عجمی و کلام او عربی است

من از تو باہمہ الفاظِ دین حمایت کفر
عجب نداشتہ ام تابش سہیل شبی است

نصوصِ حق پے تاویل باطل آوردن
چہ غیر شیوہ تلبیس و رسم بولہبی است

براستی - کہ بجز حق نگفتہ است اقبال
مگر بہ پیش تو منظورِ قوت غضبی است

من از برائے عتابت سبب شناختہ ام
نگویم این کہ عتابت بر او ز بے سببی است

ملال خاطرت "الحق مرٌّ" آمدہ است
بکام اہل حق آں را حلاوت رطبی است

سخن ز درد دل خویش گفتہ است اقبال
نہ آں لطیفہ شعرے نہ نکتہ ادبی است

مجوز فطرت اقبال لفظ آرائی
فغان خاطرِ غمگیں نہ نغمہ طربی است

بلند فطرت او پے بسوئے معنی برد
یقیں شناس کہ بر لفظ بیحد آنکہ غبی است

مگر از آں بغلط داشتش صبی خواندی
کہ ہست قلب سلیمش بہ معنئے کہ صبی است

تفو بماہ فگندی بچہرہ تو فتد
کہ تو فتادہ بجائی علوِّ او وہبی است

کنی بہ اہل دلے نسبت دروغ و دریغ
نگر برائے کہ خود ایں شعار مکتبی است

بچشم سر نگری گاہ چشم دل بکشا
نگر بہ قلب سلیمش چہ مایہ حق طلبی است

ہمے دروغ نگوید کسے کہ آزاد است
دروغ از او بشنو کو بہ دستِ نسبی است

چو اعتماد بہ تیج است خود محدث را
بہ تیج بیں کہ چہ فاش آں حدیث زیرلبی است

---

۱ روزنامہ انصاری مورخہ ۱۹/۲ ۳۲ء نامہ مولوی حسین احمد" میں اس تحریف اور اہتمام کو دیکھکر چپکا رہ گیا اور تقریر کا بڑا حصہ انصاری اور تیج میں بھی چھپا۔"

بگفت می نبود قومہا ز مذہب و رنگ — وے ز ملک و وطن ہست" و لیجہ بوالعجبی است

کنوں کہ نامہ او دیدہ ام بہ انصاری[2] — بگفتہ "مذہبی و ملکی است" و ہم نسبی است

بگفتہ است کہ "از رنگ قوم می خیزد" — کہ ایں چو سنگ سیہ واں چو شیشہ حلبی است

بچند قول تناقض عیاں ہمی بینم — چو ایں زبادی دیں نبی است بوالعجبی است

کدام کذب کدام است راست می دانی — تو حق بپوش و بکس ہم مگو کہ بے ادبی است

بنائے قوم چناں می فتد چرا گفت است — محدثے کہ سبب جستنش ز بے سببی است

مراد چیست ز "بنتی ہے یا نہیں بنتی" — زمن بپرس کہ آں نیز نکتہ ادبی است

مرادش اینکہ ز مذہب فلاح قومی نیست — وے ز ملک و وطن ہست وے چہ بوالعجبی است

خود او ز کیش کند قوم را بنا تسلیم، — تو گفتہ کہ ہمیں کشوری است یا نسبی است

گواہ چیست درایں قول و مدعی سست است — پس ایں لطیفہ قانونی است یا ادبی است

زبان طعن کشودی بفرق ملت و قوم، — بہ بند لفظ فتادی ز فہم خود کہ صبی است

ز ملت امت مسلم مراد اقبال است — کہ قوم نزد محدث ز اتباع نبی است

دگر برائے چہ گفتہ کہ آں ز مذہب نیست — مگر برائے جواہر سر زباں طلبی است

اگر ز دیش بود قوم باز رو بہ عرب — کہ ہند از پے ہندو۔ نژاد تو عربی است

۱۔ اخبار تیج مورخہ ۱۲/۳/۳۸ء "آج قومیں مذہب اور رنگت سے نہیں بنتیں بلکہ دیش اور ملک سے بنتی ہیں"

۲۔ روزنامہ انصاری دہلی ۱۸ ذی الحجہ ۱۳۵۶ھ مطابق ۱۹/۲/۱۹۳۸ء

۳۔ مولانا سہیل سربرآوردہ وکیل اور بلندپایہ ادیب ہیں۔

اذاں خطاب بہ "یقوم" مرسلاں کردند کہ زد و نصح زبیگانگاں شعار ابی است
نبی ما ز کرم گرچہ "اهد قومی" گفت ندانی ایں کہ زنسبت چہ مدعائے نبی است
دعا ز نسبت او شد قریب تر بہ قبول کمال مرحمتش شان مرحمت طلبی است
بہ اینہمہ تو اگر بہرہ از ادب داری بگو کہ طائفہ کافراں ز قوم نبی است

بما ز رفق و مدارا سخن چہ میگوئی بہ دین پاک نہ غلظت نہ رفق بے سببی است
بہ "بینہم رحما" اقتدا کند مومن ازاں کہ غایت آں اہتدا براہ نبی است
ولی مومن اگر می شود بجز مومن بمن نما کہ ز فرمودۂ خدا و نبی است
مجاہدانہ تعاون بما کہ ہم وطنیم چرا حرام شد آخر نہ بادہ عنبی است
قوی است حبل متین گاہ اعتصام بخواہ مرو براہ تفرق کہ آں زیاں طلبی است
بیاد آر گہے امر جاہد الکفار کہ آں بقائے ترا ضامن است و رسم نبی است
بگو بہ کافر ہندی خلوص اینہمہ چیست نہ کافر وطنت مثل کافر اُرُبی[1] است
گرفتہ تو از ایشاں کدام عہد وفا زخویش خیط غلامی نہ آشتی طلبی است

شمردہ است محدث ز ملک و دین اب و اُم ندانم از کہ تو گوئی کہ آں و ز آل نبی است
تو آنِ "عمل غیر صالح" خواندی بطفل تو - کہ وارد بہ مصحف عربی است
اگر براہ نبی نیست کس چہ می خیزد از ایں کہ آدمی و بہ نسل مطلبی است
نبردہ نام سیادت ادب نگہدارم اصول سنج کہ فرمودہ خدا و نبی است

---

[1] یورپین مراد ہے بہ ضرورت شعر تصرف کیا ہے۔

خدائے پاک چو فرمود لیس من اهلك   بہ کفر و دینِ مبین قطع نسبت نسبی است

گر او ز آلِ نبی ہست ارزش برساں   سرِ شعر من کہ از او ایں گذارشم ابلی است

گمان مدار کہ آبے بروے کار آرد   بہ اہل نار تولاکہ عین بولہبی است

ثبات کفر ندارد بپائے خویش بایست   چہ اعتماد بپائے دگر کہ ہم خشبی است

گر آسیائے کس از آب زر ہمی گردد
نظر کن کہ ترا نیز آبرو وہبی است

ملت و قوم

(از جناب مولانا یعقوب بخش صاحب راغب بدایونی)

کسے کہ خاست پئے نصرت حسین احمدؐ / قیامتش آفت دینی و لغزشش ادبی است

بعقل سوختہ در بر حریف مقبل شد / مگر بہ شمس نہار احتراق نجم شبی است

خیال درک سخن از کسے چہ باید کرد / کہ او زبار سیاں است و گفتگو عربی است

کہ گفت بر سر ممبر دروغ میدانی / دروغ گفتن و تکذیب ایں چہ بوالعجبی است

غلط سرود محدث کہ قوم از وطن است / چرا کہ مسلم و قومیتش ز دین نبی است

ز ملت آمدہ اہلش مراد علامہ / "مگر بہ نکتہ کجا پے برد کسے کہ غبی است

بگیر اہل ز ملت چو "واسئل القریۃ" / بداں کہ حذف مضاف از لطائف ادبی است

بیار نص صریحے کہ امت از وطن است / بخواں حدیث صحیحے کہ قوم ما نسبی است

غلط نواختہ در فرق ملت و قوم / "یکے ز کیش و دگر کشوری است یا نسبی است

یکے است دین ، نہ زدین - دین ز دین چہ می باشد / دگر جماعت و صنفی و جنسی و نسبی است

دو قوم مومن و کافر بیک بلد بنگر / بمصر و مکہ نظر گر بمصحف عربی است

وقوم کل نبی یکون امتہ / خطاب شان نہ ز ہم کشوری و ہم نسبی است

بغیر قوم نباشد وجود ملت را / چو قوم دیں محدث مگر وطن سببی است

کہ می برد سخن حق بہ دیوبند از ما / بہ اہل نار موالات عین بولہبی است

محدثے کہ ز نہرو خریدہ لہو حدیث / بے روایت آں تارک حدیث نبی است

خود آ و معتر شدہ ادنے ز ہندیاں بستم / کہ گویدش مدنی ہست و ہم ز آل نبی است!

چساں بود مدنی کو مدینہ را بگذاشت / بہ ہندیاں سر ہم ملکیش چو ہم نسبی است

نشین براہِ محدث ابلیسہ بازش آر
کہ این تتبع ہنرو خلاف راہ نبیؑ است

اس مسئلہ کے متعلق ہم اپنے خیالات کا اظہار کر چکے یعنی محض وحدت وطنی ایک قوم کی بنیاد نہیں ہو سکتی، لیکن اس پر اتفاق اور اختلاف کی گنجائش ہے، ہمیں شکایت ہے تو اس لب ولہجہ کی جو بعض اشعار میں علاّمہ اقبال اور مولانا حسین احمدؐ جیسی ہستیوں کے متعلق اختیار کیا گیا ہے۔

(لیمث)

اقبال

(حفیظ نقشبندی برہانپوری متعلم بی۔ اے)

نغمۂ عبرت سے پُر تیرا ربابِ زندگی
ہر نفس تیرا پیامِ انقلابِ زندگی

تو نے اِس انداز سے لکھدی کتابِ زندگی
ہر ورق گویا کہ ہے تفسیرِ بابِ زندگی

پھونکدی تو نے تنِ مسلم میں اک روحِ حیات
پیکرِ بیجاں کو بخشی آب و تابِ زندگی

جگمگا اٹھی نظر کے سامنے تصویرِ نور
تو نے ہم سب کو پلا دی وہ شرابِ زندگی

ہے درخشاں ہر طرف تیرے تخیل کی ضیا
قوم کے گردوں پہ تو ہے آفتابِ زندگی

ہم میں تاریکی ہے پُر ہول و خطر ہے راستہ
تو ہمارے واسطے ہے ماہتابِ زندگی

ہم کو سوتے سے جگایا تو نے اے خضرِ طریق
کر دیا بےچین دیکر اضطرابِ زندگی

کاروانِ قوم کی بانگِ درا اقبال ہے
قوم کی کشتی کا واحد ناخدا اقبال ہے

تیرے اشعارِ حکیمانہ نگارِ زندگی
تو جہانِ علم و حکمت کی بہارِ زندگی

تیری ہستی مایۂ صد افتخارِ زندگی
تیرے ہاتھوں سے ہوا قائم شعارِ زندگی

مشرق و مغرب میں ہے تیرا تخیل جلوہ گر
اے تری ذات ہمایوں رازدارِ زندگی

تیرے میخانے میں ہے عطار و رومی کی شراب
ہے ترے ساغر میں کیفِ اعتبارِ زندگی

فارسی علم و ادب کے اے درخشندہ گہر
ہر نفس میں تیرے پنہاں ہے شرارِ زندگی

تیرے اشعارِ حکیمانہ کا دیکھا یہ اثر
ذرہ ذرہ بن گیا آئینہ دارِ زندگی

باغِ ملت میں نفس تیرا نسیمِ جانفزا
جس کے دم سے ہے شگفتہ لالہ زارِ زندگی

تقویت ملت کو تیری حکمتِ محکم سے ہے
سچ تو یہ ہے قوم کا اقبال تیرے دم سے ہے

نقد و تبصرہ

(ہم معذرت خواہ ہیں کہ اقبال نمبر کی تیاری، اور بعض دیگر اہم مصروفیتوں کے باعث ہم اس مرتبہ تمام موصولہ کتب اور رسائل پر تبصرہ شامل نہ کر سکے اور نہ جائزہ تصانیف زبان اُردو ۱۹۳۶ء کی دوسری قسط پیش کر رہے ہیں۔ انشاء اللہ آئندہ اشاعت میں یہ کمی پوری ہو جائیگی)

ہدیہ اخلاص بحضرت اقبال، از محمد یحیٰی صاحب اعظم گڈھ۔ ناشر عبد اللطیف اعظمی

اس چھوٹے سے رسالے میں یحیٰی صاحب کی دو نظمیں "خطاب بہ شاعر حکیم ہند" (جو جامعہ دسمبر ۱۹۳۲ء میں شائع ہو چکی ہے) اور شاعر مشرق اور فلسفۂ حیات ملی، شامل ہیں۔

پہلی نظم میں علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کی حکیمانہ شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ ہے لیکن آخر میں شاعر کی طرف سے ایک شکوۂ بے اختیار بھی شامل ہے۔ دوسری نظم بطور کفارۂ گناہ کے لکھی گئی ہے جس میں علامہ کی شاعری اور تعلیم کو سراہا گیا ہے۔

نظمیں دونوں کامیاب اور رواں ہیں، بعض اشعار بیحد شگفتہ ہیں ہم یحیٰی صاحب اور عبد اللطیف صاحب دونوں کو اس ہدیہ اخلاص، پر مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

(لیث)

شرح محمّدی منظوم | از سلمان احمد صاحب ہلالی قیمت عمر محلہ سوتھ بدایوں کے پتہ پر ناظم صاحب سے مل سکتی ہے۔

یہ ایک مختصر منظوم رسالہ ہے جس میں شرح محمدی یعنی (Muslim Law) کو نظم کیا گیا ہے۔ پرانے زمانے میں ہماری درسیات میں اکثر ایسی منظوم کتابیں شامل ہوتی تھیں جن سے واقعات، لغات اور اصولِ قواعد حفظ کرنے میں مدد ملتی تھی لیکن تعلیم کا نقطۂ نظر بدلنے کے بعد اس طرز کی کتابیں مقبول نہیں رہیں اور عرصہ سے اس قسم کی کتابیں دیکھنے میں نہیں آئیں

سلمان صاحب ایک نوجوان شاعر ہیں جن کا کلام اکثر بریلی کالج میگزین میں شائع ہوتا رہا ہے۔ موصوف نے اب ایل ایل۔ بی کی ڈگری لیکر کالج کو خیرباد کہا ہے اور اپنے وطن بدایوں میں وکالت شروع کی ہے اسی پیشہ کی مناسبت اور فطری ذوق کی اعانت سے آپ نے شرح محمدی کو منظوم کیا ہے اور موصوف کا خیال ہے کہ اس سے قانون کے نکتے دماغ میں محفوظ کرنے میں مدد ملیگی

مجموعی حیثیت سے یہ منظوم کتاب دلچسپ ہے اور سلمان صاحب کی شاعرانہ قدرت کا اس سے اچھا اندازہ ہوتا ہے ہر شعر کا مفہوم بالکل واضح کر دیا ہے اور اکثر فٹ نوٹ میں تشریح بھی کی ہے دلچسپی رکھنے والے حضرات سلمان احمد صاحب ہلالی سے طلب کر سکتے ہیں۔

(لیث)